اللہ نور السمٰوات والارض

قرآنی حقائق
تصوف کے آئینہ میں

از قلم

ترجمان حقیقت حضرت قبلہ صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ
(بیربل شریف ۔ ضلع سرگودھا)

ادارۂ تصوف
نظام بلڈنگ ۔ موہنی روڈ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵

تعارف

قرنہا باید کہ تا صاحبدلے پیدا شود

بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

منقصد کن فکاں حق آگاہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور یہی دولت عرفان ہے جو کبھی الہام ربانی کو جذب کرتی ہے اور کبھی سینے کے سوتے کھولتی ہے یہی نور اعظم جسم عالم میں آنکھ کی پتلی ہے اور قلب جہان کے لیے سامان جنبش، اس کا قلیل بھی کثیر ہے۔ اور اس کا کم تر بھی برتر و اعلیٰ۔

مرد حق آگاہ اُمّتِ مرحومہ میں مسندِ رسالت کا جانشین اور خلافت نبوت کا مستحق اولین ہے۔ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل کی بہترین سند فخر دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے زمانہ کے جن حبیبیوں اور بایزیدوں کو عطا ہوئی اُن کی تعداد ہر دور میں تعجب انگیز قلت میں رہی ہے اور پھر اس قلت کو کم آمیزی سنے اور بڑھایا۔

اس راستے میں قلت الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم ملنا جلنا) خدا جوئی اور مقصود وری کا لازمہ قرار پایا۔

خودی رامردم آمیزی دلیل نارسائی ہا | تو اے درد آشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا

اور مردان کامل نے اپنی بلندی کو چشم ظاہر بین سے چھپانے کے لیے اپنی روش میں نشانات ظاہر کو ترک کرنا محبوب قرار دیا۔

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش | ایں چنیں زیبا روش کم تر بود اندر جہاں

اکثر ایسا ہوا ہے کہ ولایت و عرفان گودڑی میں لعل بن کر چھپے رہے ہیں۔ اور محروم جستجو نگاہیں صرف گودڑی کو دیکھ کر لعل مقصود سے محرومیت کا داغ لے گئیں۔

لیکن صدقِ طلب اور بلندی استعداد نے طالبِ حق کو مردِ کامل کی تلاش میں کامیاب کیا۔ اور ظاہر کی بیگانہ وشی حسن و جمال باطن کا پردہ نہ بن سکی اور متجسس نگاہوں نے سادگی کے بھیس میں حسن و جمال باطن کی سب ادائیں دیکھ لیں۔ ؎

لاکھ چمکیں بن سنور کر ماہ رویانِ جمال　　سادگی پر اُن کی قرباں ساز و سامانِ جمال

آج جس جنید زمانہ اور بایزید وقت، قطب العالم کا تعارف مقصود ہے اس کی ذات گرامی اویسی نسبت کے غلبے سے چشم عالم سے پوشیدہ رہی ہے۔ علم ظاہر میں قدیم و جدید علوم کا دریا سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور معرفت و محبت الٰہی میں اپنی مثال آپ ہیں اور ظاہر و باطن کی برزخیت کے اس نور البشر کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی نگاہ کیمیا اثر پہلی حاضری میں دل کے میل کچیل دھو دیتی ہے۔ اور حرصِ دنیا کی پھٹکار میں آیا ہوا انسان محبت الٰہی کی خوبصورت وادی میں پہنچ جاتا ہے اور ہوائے نفس کا شکار شاہبازِ طریقت بن جاتا ہے۔ اور اقبال مرحوم کے اس نظریے کو آپ کی نگاہ حق بیں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

اگر اب بھی شعیبؑ آئے میسّر　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

طلبِ مولا میں اپنی ہمت آزمانے والا عالم ہو خواہ اَن پڑھ دونوں اس نگہِ ناز کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ پھر دونوں اپنے حال میں مست ہو کر فنا و بقا کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں۔

اس تحریر کا مقصود اور ہمارے محبت بھرے جذبات قلبی کا محور قطب العالم محبوب الٰہی سیدنا و مرشدنا حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ العالی ہیں۔ آپ اپنے جدِّ امجد شاہبازِ لامکان حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ

طالبان حق کے سامنے لائے۔ انشاء اللہ العزیز آپ ان مقدس تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہمارے ہم نوا ہو جائیں گے اور اگر غلط روش رکھنے والے متصوفہ کی غلط نقالی سے آپ اصل حقیقت کے پرتو سے محروم ہیں تو اس صحیح رہ نمائی کو غنیمت سمجھیں گے اور اس انداز فکر کو اسلام کے لیے تجدیدی کارنامہ کہیں گے۔ اور اگر آپ کا ذہن حقیقتِ اسلام اور روحِ ایمان یعنی تصوف سے کسی غلط اندیش یا ناواقفِ حال صاحبِ قلم کی غلط تعبیرات کے مطالعہ سے متاثر ہو کر نفرت پکڑ چکا ہے تو آپ حضور کی مبارک تحریریں پڑھ کر تمام غلط فہمیوں سے پاک صاف ہو جائیں گے۔ اس وقت تک ادارہ تصوف (بہ سلسلۂ قرآنی حقائق) حضور کی مندرجہ ذیل تحریرات شائع کر چکا ہے۔

قرآنی نظریۂ حیات حصہ اول۔ خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفۂ قرآنی میں حصہ دوم طریقت کی حقیقت (قرآن حکیم کی روشنی میں) حصہ سوم زیر نظر کتاب۔

حضور قبلہ عالم کی بعض تحریرات پہلے شائع ہو چکی ہیں مثلاً صراط مستقیم وغیرہ وغیرہ۔ زیر نظر کتاب طریقت کی حقیقت قرآن مجید کی روشنی میں بہت سے ایسے حقائق کا مجموعہ ہے جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ علمائے مفسرین جہاں کہیں حال اور کوائف کے متعلق کوئی قرآنی بیان سامنے آیا نہایت خاموشی سے قلم جھکا کر نکل گئے۔ اور در حقیقت انہیں مقامات کی تشریح حقیقت تصوف کا بیان تھا۔ جب پڑھنے والے صرف لفظی ترجمہ یا مختصر اور بے ربط تشریح پڑھتے ہیں تو قرآن کے ان مقامات کو بھی متشابہات کی ذیل میں شمار کرتے ہیں اور حقائق کا طالب اپنی پیاس موجود پاتا ہے۔

مثلاً موسیٰؑ اور خضرؑ کا واقعہ۔ اصحاب کہف کا قرآنی قصہ وغیرہ

ادارۂ تصوف امید کرتا ہے کہ ناظرین اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی قیمتی آراء سے مطلع فرمادیں گے اور ہمیں ممنون فرمادیں گے۔

ناظم ادارۂ تصوف موہنی روڈ
نظام بلڈنگ۔ لاہور

یہ مجلد کتاب

جو آپ کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل رسائل پر مشتمل ہے

ان رسائل میں قطب العالم محبوب الٰہی مرشدنا حضرت قبلہ صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ سجادہ نشین خانقاہ مرتضویہ بیربل شریف ضلع شاہ پور نے جانِ اسلام وایمان یعنی حقائق تصوف کو کھول کر بیان فرمایا۔ اور موجودہ دنیا کے شکوک سے بھرے ہوئے ذہنوں کو صاف کرنے کے لئے بلند احوال کو نہایت پُراثر پیرایہ میں بیان فرمایا

ادارہ تصوف نے طالبانِ حقیقت کے لئے انہیں شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اُمت مرحومہ کے اولیائے کرام نے اسلام کی جو خدمت انجام دی ہے۔ اس سے ایک دنیا واقف ہے ان پاک نفوس کے جذبۂ ایمانی کی بنیادیہی حقائق تھے جو ان رسائل میں درج ہیں آپ انہیں بار بار پڑھیں خدا کرے آپ کی محنت بارآور ہو اور حقیقت کے چہرہ سے آپ کے سامنے پردہ اُٹھ جائے۔

مہتمم

ادارۂ تصوف

سکونِ قلب بڑی دولت ہے۔

لیکن

یہ نعمت بادشاہ کو اپنی وسیع سلطنت کے باوجود نصیب نہیں

اور

یہ نعمت آپ کو ایک فقیرانہ جھونپڑی میں نصیب ہو سکتی ہے

وہ کس طرح؟

اپنی زندگی کے لمحات کو ان خطوط پہ ڈھالیں
جو یہ کتاب آشکارا کرتی ہے

(پنجاب آرٹ پریس لاہور)

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۴	۱۶	درحقیقت	دریافت
۵۷	۳	لب	سبب
۶۳	۳	جبسے	جیسے
۶۳	۶	ارادہ بندے	ارادۂ بندہ
۱۶۴	۱	ارات مند	ارادت مند
۱۷۲	۱۱	پھلے	پھلیں
۱۷۷	۱۶	بل	بل بوتے
۱۷۸	۱۳	الدنیا	حُبِّ الدنیا
۱۷۸	۱۴	دنیا	حُبِّ دنیا
۱۸۰	۱۲	بنیوا	بے نوا
۱۸۴	۱۱	بہت مصلحین	بہت سے مصلحین
۱۸۴	۱۳	حیثیت جائیگی	حیثیت آجائے گی
۱۸۴	۱۷	کس درجہ کرتی ہے	کس درجہ اتفاق کرتی ہے
۱۸۷	۱۲	اتمام	اتمام پر
۱۸۷	۱۵	پر ہے	پڑ رہے
۱۸۸	۳	مسلمان	مسلمانوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۸	۵	احیتنی	احیینی
۱۸۸	۱۹	کرکے	کر
۱۸۹	۱۶	دین کی مدار خیال کی جائے	دین کا مدار خیال کیا جائے
۱۹۲	۸	انبیاء	اغیار
۱۹۴	۱۴	صرف کر دی	صرف کر دیں
۱۹۵	۳	خود اُٹھ جائیں	خود بخود اُٹھ جائیں
۲۰۱	۱۹	چمکتے	چمکنے

فہرست مضامین "طریقت کی حقیقت"

حقائق الٰہیہ کو حال کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ بار بار پڑھیں تاکہ حقائق کی تاثرات سے فائدہ اُٹھایا جا سکے

ادارۂ تصوّف

مادی دنیا روحی دنیا سے اگرچہ بہت کچھ دور ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے تاہم سکون اور اطمینان قلبی کی جستجو میں پریشان ہے اور بہت سی الجھنیں علمی طور پر اس راہ میں پیدا کر دی گئی ہیں۔ تصوّف و فقر سراسر سکون ہے۔ اور ہر پریشان حال کو سکون کی دعوت دیتا ہے اس لئے عام طور پر طبیعتیں اہل تصوّف اور تصوّف کی پیاس رکھتی ہیں۔ لیکن موجودہ وقت میں کوئی ٹھوس علمی رسالہ تصوّف پر پیش نہیں کیا جا رہا اس صورت پریشان حالی کو دیکھتے ہوئے چند احباب نے یہ ادارہ قائم کر دیا ہے۔ تاکہ اس سے بنیادی اور بلند پایہ مضامین اور مقالات شائع کر کے دعوتِ فکر کا سامان مہیا کیا جاوے۔ ادارہ کو وسعت دینے کے لئے اہلِ فکر و نظر کو دعوت دی جاتی ہے۔ کہ وہ ادارہ کے ارکان میں داخل ہو کر ہماری امداد کریں۔ مستقل ارکان کے نام کا رجسٹرڈ ہونا لازمی ہے۔ تاکہ شائع کردہ مقالات کی اطلاع دی جائے۔ چندہ ممبری حسبِ طبیعت ہے۔

منجانب: مہتمم ادارۂ تصوّف نظام بلڈنگ موہنی روڈ۔ لاہور

پیش لفظ

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ○ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ○ يَفْقَهُوا قَوْلِي ○

جہلا سے سنتے آئے ہیں کہ میاں! شریعت کو طریقت یعنی علم معرفت سے کیا تعلق! لیکن یہ دیکھ کر اور غیرت ہوئی۔ کہ علمی دنیا بھی اب یہ کہنے لگی ہے کہ تصوف و طریقت کا نشان کتاب و سنت میں نہیں ملتا۔ آخر تصوف اور طریقت کیا ہے! یہی الٰہی معرفت ہی نہیں؟ پھر کیا قرآن حکیم معرفتِ الٰہیہ سے خالی ہے؟ اور قرآنِ حکیم صرف اخلاق، قوانین اور سیاست ہی ہے اور بس؟ اگر ایسے ہے تو پھر ان اخلاق و قوانین و سیاست کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے کیا تعلق!

یہ کارخانہ کائنات تو اپنی شناسائی[1] کے لیے تیار کیا اور پیغمبر اپنی معرفت

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

کے لئے رہنما بنائے اور اسی رہنمائی کے لئے قرآن حکیم کا نزول ہُوا لیکن یہ سب کچھ حق ہونے کے باوجود یہ کہا جائے کہ کتاب وسنت میں معرفت کا نشان نہیں تو کونسا عقلمند ہے جو یہ باور کرے۔

اصل میں ریڈیو اسٹیشن سینکڑوں ہیں لیکن اپنا ریڈیو وہی آواز پکڑتا ہے جس کے لئے ہمیں خواہش ہو اور اس سے دلبستگی ہو۔

بعینہٖ یہی حال ہے کتاب وسنت کا۔ جسے جس چیز کی طلب ہے وہ اس سے چھانٹ لیتا ہے۔ اور دوسرے علوم ومعارف کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ آج کل سیاست کی طرف توجہ زیادہ ہے اور اسی پر علمی طبائع قرآن حکیم کی تفسیر میں لگی ہوئی ہیں۔ ایک عام امر جس کو سیاست سے کسی قسم کا تعلق نہیں اس کو بھی کھینچ تان کر اپنے سیاسی نظریہ کے ماتحت لایا جاتا ہے ورنہ قرآن حکیم تو سراسر معرفت ہے اور معرفت کے لئے نازل ہُوا۔ تاکہ اللہ کے بندے اپنے مولا اور اپنے رب کی شناخت کریں۔ اور اس کی عبادت اور اطاعت سے بہرہ ور ہو کر فلاح دارین پر کامیاب ہوں۔ اگرچہ بعض جزوی مسائل معاشی اور معاشرتی بھی اس کے اندر حسب موقع جھلکتے ہیں لیکن اصل مقصود تو معرفتِ الٰہیہ ہی ہے اور غالباً کسی کو اس سے انکار نہیں ہوگا۔

ہر دانشور جانتا ہے۔ کہ عمل کی بنیاد علم ہے یعنی ہر عمل کا بیج (تخم) علم ہے۔

لہ (گذشتہ صفحے کا حاشیہ) جو لوگ پیٹ کو ہی اصل مقصد کائنات خیال کرتے ہیں۔ اگر ایسے ہی ہے تو پھر اس کارخانہ قدرت کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت اور خدا تعالیٰ کو تسلیم کرنا کیا معنی رکھتا ہے ایسی صورت میں الحاد ہوگا دین نہ ہوگا۔

اس لئے جب تک معرفتِ تامہ نصیب نہ ہو احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لئے تیاری نہیں ہو سکتی۔ خواص (انبیاء علیہم السلام) کو پہلے معرفت دی جاتی ہے اور معرفتِ شناسائی ذات کے بعد احکامِ الٰہی سے سرفرازی بخشی جاتی ہے اور الہامی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن عوامِ امت کو تیقّن انبیاء (خواص) کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ خواص کے پیرو ہو جاتے ہیں۔ اس لئے عوام کو پہلے عمل کی دعوت ہوتی ہے اور پھر عمل۔ ان کو علم کی طرف لے جاتا ہے۔ اور عمل[1] کا تواتر معرفت کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

معرفت کا پہلا زینہ شریعتِ حقّہ ہے۔ اور دوسرا زینہ طریقتِ حقّہ ہے۔ شریعت پر پابند ہونے سے گاہے خود دوسرے زینہ پر قدم اٹھ جاتا ہے اگر استعداد کامل ہو۔ ورنہ دوسرے زینہ کے لئے کچھ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے پہلے زینہ کے لئے علمائے کرام کی خدمت میں حاضری ضروری ہے۔ اور دوسرے زینہ کے لئے صلحائے کرام و اہل دل اللہ والوں کی خدمت میں حاضر ہونے سے شرفِ سعادت حاصل ہوتا ہے۔ علمائے شریعت کا یہ کہنا کہ شریعت کے سوا طریقت کچھ نہیں بے شک ایسے ہی ہے۔ دوسری جماعت کی بنیاد جماعت اول ہے لیکن شریعت کی تکمیل اور شریعتِ حقّہ کے اندر جان ڈالنے کے لئے طریقت رُوح کا کام دیتی ہے۔

---

[1] اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ ترجمہ: جن لوگوں نے ہمارے لئے مجاہدے کئے ہم ان پر اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

کسے معلوم نہیں کہ توحید کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو تشریعی ہے اور دوسرا تکوینی۔ تکوینی توحید پر کائنات کی تخلیق ہے۔ اور تخلیق کے بعد کائنات کے چلن کا مدار تشریعی توحید پر ہے لیکن خود سوچئے جان کے سوا جسم کیسے فعال ہو سکتا ہے۔ اسلئے تمام قرآن حکیم تکوین و تشریع سے بھرا ہوا ہے۔ اور یہ حبل اللہ (الٰہی رسّی) تکوین و تشریع کی تاروں سے گوندھی گئی ہے جس کی آمیزش معجون سی ہوگی۔ اور کسی ایک جزو کا دوسرے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی نابکار ایسے کر بھی لے تو اسلام کی رسّی کھل جانے سے بیکار ہو جائے گی اور اپنی مضبوطی کھو بیٹھے گی۔

یہ چند صفحے طریقت کی حقیقت پر پیش کئے جاتے ہیں صرف نمونتہً ورنہ قرآنِ حکیم کا ایک ایک ورق، ایک ایک صفحہ اور ایک ایک سطر اسی معرفتِ الٰہی کی رہنمائی سے بھرپور ہے۔ صرف وضاحت کے لئے کچھ عرض کر دیا گیا۔ تاکہ ظاہر بین اپنے دل کی بصارت سے یہ اشارات پا کر مطمئن ہو جاویں اور ناحق دھبہ تصوف پر نہ لگاویں کہ یہ کتاب وسنت سے باہر ہے ورنہ ہوشیار کے لئے تو سعدیؒ کا ایک شعر ہی کافی ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورق دفتریست ز معرفتِ کردگار

ذرا ہوشیار ہو کر اور فرقہ و مسلک سے بلند ہو کر یہ اوراق بکررسہ کرر پڑھینگے تو انشاء اللہ وہ کچھ حاصل ہوگا جس کی آپ کو فطرتاً پیاس ہے۔ قرآنی حقائق کا حصہ اول و دوم "قرآنی نظریۂ حیات" اور "خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفۂ قرآنی میں"۔ غالباً آپ پڑھ چکے ہوں گے یہ حصہ طریقت کی حقیقت اسی مقالہ کا تیسرا حصہ ہے۔

"ضروری ہے کہ پس منظر دوبارہ مطالعہ کر لیں"

اس حصہ میں صرف سورہ الکہف کی پہلی آیات اور آخری حصہ سے موسیٰؑ اور خضرؑ کی بابت آیات کی تفسیری وضاحت کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ فرقہ و مسلک سے بلند ہو کر اس حصہ کے اوراق کا مطالعہ فرما دیں گے اور بعض امور کو نیا پائیں گے۔ جو پہلے مفسرین کی توضیحات میں نہیں مل سکے۔ ہاں بعض آخری دور کے مفسرین مثلاً مولانا آزاد وغیرہ کے تفسیری نوٹوں میں بعض اشارے پائے جاتے ہیں لیکن یہ تسلسل جو ہماری تفسیری وضاحت میں آپ پائیں گے کہیں اور نہیں پائیں گے تفسیر قدیم ہو یا جدید۔

زیادہ وجہ تو یہ ہے کہ علمائے کرام کو فقر و تصوف کے ساتھ کلی مناسبت نہیں۔ اور وہ زیادہ تر علمی تحقیقات میں کھوئے جاتے ہیں اور اصل مدعا پر توجہ نہیں دے سکتے۔

اہلِ تصوف جو تفسیری مقامات تصوف کی بہترین تشریح و توضیح کر سکتے ہیں وہ اپنے خیال میں سرمست علم کی طرف توجہ نہیں دیتے اور مقامات تصوف و معرفت سے علمائے ظاہر جیسے سے نکل جاتے ہیں اور کسی خاص چیز کو ایسے مقامات سے بیدا کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ مثلاً اصحاب کہف اور خضرؑ و موسیٰؑ کے قصہ میں کچھ ایسے نتائج اور حقائق واضح نہیں کئے گئے جو دوسرے مقامات پر نظر آتے ہیں اور جن کے بیان کی بہت بڑی ضرورت تھی۔

اصحاب کہف میں تو سلسلۂ سیاق و سباق کو مدِنظر نہ رکھتے ہوئے اور الکہف کا صحیح ترجمہ اور تخیل سامنے نہ لاتے ہوئے جو کچھ لکھا گیا وہ تمام بے جوڑ اور بے مقصد نظر آتا ہے اور اصل مسئلہ پہلے سے بھی پیچیدہ ہو گیا۔ امید ہے کہ میری گستاخی معاف کرتے ہوئے اصل حقیقت کو دیکھنے میں کوشاں ہو کر ہمارے ذوقِ تفسیری

سے خوش ہوں گے اور اپنے اختلاف رائے سے مطلع فرما کر مشکور فرمادینگے

آدمی از سہو و خطا پاک نیست

آبِ رواں جز خس و خاشاک نیست

خیر اندیش شریعت و طریقت

محمد عمر کان اللہ لہٗ بیربلوی

مقام کھوڑہ ۲۷ جولائی ۱۹۶۱ء

نوٹ : برادرانِ طریقت کا فرض ہے کہ برادرانِ غیر طریقت تک یہ چند اوراق پہنچادیں اور ثواب دارین حاصل کریں ۔

مذہب سراسر اطمینان ہے۔ کیونکہ
اس کا مقصد معین اور اس کے وسائل
اور راستے واضح اور روشن اور مرنے
کے بعد ایک درخشاں زندگی کا تصور
پیش کرتا ہے۔

○

ادارۂ تصوف بلند پایہ معیار پر قائم ہے۔ اور رسمی قیود سے آزاد۔ اس کی مطبوعات تسکینِ دل پیدا کرتی ہیں۔ اور فطرتِ انسانی کی پیاس بجھاتی ہیں۔ آپ بھی اس کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالیں۔

مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں۔

قرآنی نظریئہ حیات	قیمت	۸ ر
الہامی	"	۱۲ ر
طریقت کی حقیقت (قرآنی آیات میں)	"	۱۲ ر

نوٹ :- تینوں کتب اکٹھی خریدنے والے کو مجلد صرف دو روپے میں دی جائیں گی۔

(گلزار عالم پریس لاہور)

پس منظر

بعض دینی تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لئے اعتراض اور شبہات کے جو وار اقدارِ تصوف پر کئے گئے ان سے متاثر ہو کر یہ چند اوراق خدمتِ دین تصور کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔

امید ہے کہ ان اوراق کے پڑھنے سے خود بخود وہ شکوک و شبہات رفع ہو جاویں گے جو بعض علمی حلقوں کی طرف سے اقدار تصوف پر کئے گئے۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ تصوف اسلام کے حال و قال کے مجموعے کا نام ہے اور تصوف روح اسلام ہے۔ اور اس کی بنیاد کتاب و سنت کے سوا کچھ نہیں اور کہ اس کی زندگی اسلام کی زندگی ہے اور اس کی موت اسلام کی موت۔ کیونکہ کوئی جسم بلا جان زندہ نہیں رہ سکتا۔

توحید و رسالت جو اصل سرمایۂ دین ہے اس کی تکمیل ہی اولین مقصد تصوف ہے اور بس حقیقی صوفی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا عکس ہوتا ہے اور رسالت کی نیابت کے تمام فرائض ادا کرتا ہے۔ اس مقالے کے پانچ حصے ہیں۔

(۱) قرآنی نظریۂ حیات۔ (۲) خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفۂ قرآنی ہیں۔

(۳) طریقت کی حقیقت قرآنی آیات ہیں (۴) درسِ تصوف کا ایک عملی سبق سورہ مزمل ہیں۔

(۵) قرآن اور تصوف۔

"دنیا فانی" تصوف کا پہلا عقیدہ توحید کے بعد ہے جس پر تصوف کا مدار

حقیقی ہے اور ہر مذہب کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے بھی اس عقیدہ یا نظریہ کو کئی بار مختلف طریقوں سے جاگتی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

لیکن آج اس نظریہ کو پیش کرنے کی جرأت کسی کو نہیں کیونکہ مادی دنیا کا غلبہ اتنا ہو گیا کہ روحانیت کا کوئی نظریہ پیش کرنا ساری سوتی دنیا سے مقابلہ کرنا ہے جو کسی کی ہمت نہیں اس لئے ہم نے سب سے پہلے پیش کرنے کی جرأت کی۔

اس سے پہلے خانقاہی تصوف پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے۔ وہ علم دوست حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اور تصوف کے اقدار کو خصوصاً خلوت پسندانہ طریقہ کو نہایت ناموزوں الفاظ سے دہرایا جاتا ہے۔ تاکہ دلوں میں نفرت پیدا ہو اور تصوف کو اسلام سے بیگانہ خیال کیا جائے۔ امید ہے کہ آپ ہر نظریہ کا پوری توجہ سے مطالعہ فرمائیں گے اور پورے غور سے فیصلہ دیں گے کہ تصوف کی جان اسلام ہے یا کچھ اور سے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ○ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِھِمَا نَسِیَا حُوْتَھُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ○ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَبًا ○ قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ عَجَبًا ○ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا ○ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ

اور جب کہا موسیٰؑ نے واسطے جوان اپنے کے کہ نہ ٹلوں گا میں یہاں تک کہ پہنچوں میں جگہ ملنے دو دریا کے۔ یا چلا جاؤں برسوں تک پس جب پہنچے دونوں جگہ ملنے کے درمیان ان دونوں کے بھول گئے مچھلی اپنی پس پکڑی اس نے راہ اپنی دریا میں خشک۔ پس جب گذر گئے اس سے کہا واسطے جوان اپنے کے لے ہم کو کھانا ہمارا صبح کا البتہ تحقیق ملے ہم اس سفر اپنے سے رنج کو۔ کہا کیا دیکھا تم نے جب جگہ پکڑی تھی ہم نے طرف پتھر کی پس میں بھول گیا مچھلی اور نہ بھلا دی مجھ کو وہ مچھلی مگر شیطان نے۔ یہ کہ ذکر کروں اس کا۔ اور پکڑی اس نے راہ اپنی بیچ دریا کے عجب۔ کہا یہی ہے جو کچھ تھے ہم چاہتے پس پھر آئے دونوں اوپر نشانوں پاؤں اپنے کے نقش دیکھتے پس پایا ایک بندے کو بندوں ہمارے سے کہ دی تھی ہم نے اس

مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ○ قَالَ — رحمت نزدیک اپنے سے۔ اور سکھلایا تھا ہم
لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ — نے اس کو اپنے پاس سے علم۔ کہا واسطے اس
عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا — کے موسٰی نے کیا پیروی کروں میں تیری
عُلِّمْتَ رُشْدًا ○ قَالَ — اوپر اس کے کہ سکھاوے تو مجھ کو اس چیز سے
اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ — کہ سکھایا گیا ہے تو بھلائی۔ کہا تحقیق تو ہرگز
صَبْرًا ○ وَكَيْفَ تَصْبِرُ — نہ کر سکے گا ساتھ میرے صبر۔ اور کیونکر صبر
عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ — کرے گا تو اوپر اس چیز کے کہ نہیں گھیرا تو نے
خُبْرًا ○ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ — اس کو سمجھ سے۔ کہا البتہ پاویگا تو مجھ کو اگر
شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ — چاہا اللہ نے صبر کرنے والا اور نہ نافرمانی
لَكَ اَمْرًا ○ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ — کرونگا میں واسطے تیرے کسی حکم کی۔ کہا پس
فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى — اگر پیروی کرے تو میری پس مت سوال کیجیو مجھ
اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ○ — سے کسی چیز سے یہاں تک کہ شروع کروں میں واسطے
فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا — تیرے اس کا ذکر۔ پس چلے دونوں یہانتک کہ
فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ — سوار ہوئے بیچ کشتی کے۔ پھاڑا اس کو۔ کہا
اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ج — کیا پھاڑا تو نے اس کو تا کہ ڈبا دیوے لوگوں
لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ○ — اسکے کو۔ البتہ تحقیق لایا تو ایک چیز بھاری۔
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ — کہا۔ کہ کیا نہ کہا تھا میں نے یہ کہ تو ہرگز
لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ — نہ کر سکے گا ساتھ میرے صبر۔
قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا — کہا مت پکڑ مجھ کو ساتھ اس چیز کے

نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ	کہ بھول گیا میں۔ اور مت ڈال اوپر میرے
اَمْرِيْ عُسْرًا ۝ فَانْطَلَقَا	کام میرے کے تنگی یعنی دشواری پس چلے
حَتّٰى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا	دونوں۔ یہانتک کہ جب ملے ایک لڑکے
فَقَتَلَهٗ لا قَالَ اَقَتَلْتَ	کو پس مار ڈالا اس کو۔ کہا کیا مار ڈالا تو نے
نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ	جان پاک کو بغیر بدلے جان
نَفْسٍ ط لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا	کے۔ البتہ تحقیق لایا تو چیز
نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ	بری۔ کہا کیا نہ کہا تھا میں نے تجھ کو
لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ	تحقیق تو ہرگز نہ کر سکے گا ساتھ میرے
مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ	صبر۔ کہا اگر سوال کروں میں تجھ سے
سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ	کوئی چیز پیچھے اس کے پس مت
بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ج	صحبت میں رکھیو مجھ کو تحقیق پہنچا تو
قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝	میرے پاس عذر کو۔ پھر چلے
فَانْطَلَقَا قف حَتّٰى اِذَا اَتَيَا	دونوں یہاں تک کہ جب آئے
اَهْلَ قَرْيَةِ ن اسْتَطْعَمَا	لوگوں کے پاس ایک گاؤں کے۔
اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا	کھانا مانگا لوگوں اس کے سے پس
فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا	انکار کیا انہوں نے یہ کہ ضیافت کریں
يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ط	انکی پس پائی دونوں نے بیچ اسکے ایک دیوار۔
قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ	چاہتی تھی یہ کہ ٹوٹ جاوے پس سیدھا کھڑا
عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا	کردیا اس کو۔ کہا اگر چاہتا تو البتہ لیتا او

فِرَاقُ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ ۚ
سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيْلِ مَا لَمْ
تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ○
اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ
لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي
الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا
وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ
يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ
غَصْبًا ○ وَاَمَّا الْغُلٰمُ
فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا
اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا
وَّكُفْرًا ○ فَاَرَدْنَا اَنْ يُّبْدِلَهُمَا
رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً
وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ○ وَاَمَّا
الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ
يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ
كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ
كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ
رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا

اسکے مزدوری۔ کہا یہ جدائی ہے درمیان
میرے اور تیرے۔ اب خبر دوں گا مَیں تجھ
کو ساتھ حقیقت اس چیز کے کہ نہ کر سکا تو اس
پر صبر۔ ایپر کشتی پس تھی واسطے فقیروں کے
محنت کرتے تھے بیچ دریا کے۔ پس
ارادہ کیا مَیں نے یہ کہ عیب ڈالدوں اس
میں اور تھا پرے ان کے ایک بادشاہ
لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر۔ اور ایپر
لڑکا پس تھے ماں باپ اس کے
ایمان والے۔ پس ڈرے ہم یہ کہ گرفتار
کرے ان کو سرکشی اور کفر میں۔ پس ارادہ
کیا ہم نے یہ کہ بدلا دیوے اُن کو رب اُن
کا بہتر اس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر
مہربانی میں۔ اور ایپر دیوار پس تھی
واسطے دو لڑکوں یتیم کے بیچ شہر کے۔
اور تھا نیچے اس کے گنج واسطے ان
دونوں کے۔ اور تھا باپ ان دونوں
کا نیک بخت۔ پس ارادہ کیا
رب تیرے نے یہ کہ پہنچیں جوانی اپنی کو

وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً اور نکال لیں گنج اپنا رحمت پروردگار
مِّنْ رَّبِّكَ ج وَمَا فَعَلْتُهُ اپنے سے۔ اور نہیں کیا میں نے یہ کام
عَنْ اَمْرِيْ ط ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ اپنے حکم سے۔ یہ ہے حقیقت اس چیز
مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ٥ کی کہ نہ کر سکا تو اوپر اس کے صبر۔

آیات بالا پندرہ پارہ کے آخری دو رکوع اور سورۂ کہف کے رکوع ۸
۹ کی کل ۲۳ آیات ہیں۔ پہلے ان کو غور سے پڑھیں۔ پھر ترجمہ کو توجہ سے
دو تین بار پڑھ کر اسے ذہن نشین فرمالیں۔

سورہ کہف

اس کے اندر تین تمثیلی قصے ہیں۔ ایک اصحابِ کہف کا۔ دوسرا خضر کا۔
تیسرا ذوالقرنین کا۔ تینوں میں وجہ مشارکت یہ ہے۔ کہ تین قصوں کی شخصیتیں
غیر نبی ہیں۔ نبی نہیں لیکن اس درجہ کے ہیں۔ کہ ان کو تمثیلاً قرآنِ حکیم میں
پیش کیا گیا۔

امثالی تعلیم

قرآن حکیم میں تمثالی تعلیم و تربیت کے نمونے عام ہیں۔ اور مولیٰ کریم اس
طریقے سے بہت بڑے بڑے اہم مطالب عام فہم کرنے کے لئے مثالی طور
پر واضح فرماتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر عقل کے لئے
اس میں موقع ہے۔ فہیم اور عقیل آدمی اس سے بہت بڑے مطالب اخذ
کرتے ہیں اور کم درجہ والے اپنی اپنی عقل کے مطابق بصیرت حاصل کرتے ہیں۔

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ

اس حقیقت کو قرآن حکیم کئی جگہ موقع بموقع بیان فرماتا ہے۔ اس پارہ پندرہ میں تین جگہ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ (کہ ہم نے قرآن میں ہر طرح کی مثالیں آدمیوں کے لئے بیان کیں) فرمایا لیکن وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ○ کہ انسان بہت زیادہ جھگڑالو ہے۔ اور وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا۔ (مگر ان سے فائدہ پہنچنے کے بجائے نفرت بڑھتی گئی۔ ان آیات بالا سے ماقبل یہی الفاظ دہرائے گئے لیکن جن لوگوں کے لئے ہدایت کے سرچشمے کھول دیئے گئے۔ وہ ان امثلہ سے کمال مطالب اخذ کرتے ہیں۔

قصّۂ خضر

قصّۂ خضر بھی اسی لئے پیش کیا گیا۔ کہ مولیٰ کریم اس کے ذریعہ بہت سے اہم مطالب کی اُمّتِ محمدیہ کو تعلیم و تربیت دینا چاہتے تھے۔ خالی قصہ نہیں۔ کہ ایک قصّہ کا علم ہو جائے۔ بلکہ سراسر ہدایت و رُشد کی تعلیم ہے۔

موسیٰ ؑ

یہ وہی موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جو بنی اسرائیل کے اولوالعزم نبی اور رسول اور صاحبِ معجزاتِ ظاہرہ اور فرعون کی مملکت کو تباہ کرنے والے اور اس کے خدائی دعویٰ کی بے بنیاد حقیقت کو روشن کرنے والے تھے۔ جن کے

ذریعہ بنی اسرائیل کے لاکھوں افراد نے قبطیوں کے ظلم سے نجات پائی۔ اور صرف نجات ہی نہیں دلائی۔ بلکہ تخت و تاج کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ اور دین و دنیا کی عزت دلائی۔ یہ تمام باتیں موسیٰ علیہ السلام کی بزرگی و عظمت کے لئے کھلی اور روشن دلائل ہیں۔

خضری تعلیم کی کیوں ضرورت پیش آئی

روایات میں آیا ہے۔ کہ آپ ایک دن وعظ فرما رہے تھے۔ کہ ایک آدمی نے عرض کیا۔ کہ آپ سے کوئی زیادہ بھی علم رکھتا ہے۔ تو جواباً کہا کہ میں نہیں جانتا۔ چونکہ اس جواب سے تکبّر کی بو آتی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کو اپنے خاص بندوں سے کسی صورت پسند نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے حضرت خضر کو پیش کیا۔ تاکہ وہ دیکھ لیں کہ ان کا علم ان کے مقابلہ میں کیسا ہے لیکن ایسا ہو بھی۔ تاہم ہماری سمجھ اس سے جدا گئی ہے۔ کہ یہ روایات ہیں یہ ضرورت پر اکثر پیش کی جاتی ہیں۔

اصل حقیقت

موسیٰ علیہ السلام کی فطرت تشریعی تھی تکوینی نہیں تھی۔ اور جب تک بنی اسرائیل کو خلاصی دینے کی ضرورت تھی اس وقت تک تو شریعت اور ظاہر بینی پر موسیٰ علیہ السلام کو رکھنا ضروری تھا لیکن جب یہ کام ہو گیا تو اس کے بعد علم تکوین کی تربیت دینی ضروری تھی۔ تاکہ یہ اولوالعزم نبی اپنے انتہائی

کمالات کو پہنچے۔

ہمیشہ سے ایسا چلا آتا ہے۔ کہ ہر صاحب ہدایت کو پہلے علم ظاہری سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ تو پھر دوسرا قدم اٹھانے کے لئے اس کا راستہ کھول دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اسرارِ الٰہیّہ کا مخزن ہو کر خدائے حکیم کی حکمتوں اور تدبیروں و تقدیروں سے واقف ہو کر بارگاہِ الٰہیّہ سے کسی وقت بھی سر نہ اٹھائے۔ اور ہر آن عبودیت کی جلوہ آرائیوں سے روشن ہوتا رہے۔ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ط (یہانتک کہ موت آجاوے) کیونکہ پہلا کام جب ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر دوسرے کام یعنے باطن کی آبیاری شروع ہو جاتی ہے۔

تفصیل

اس خاکہ کو واضح کرنے کے لئے تکوین و تشریع کے معمہ کو حل کرنا ضروری ہے۔ ایک قانونِ الٰہیّہ تکوینی ہے۔ دوسرا قانونِ الٰہیّہ تشریعی۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط (الانعام) اس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔ اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (تغابن) اس نے تمہیں پیدا کیا بعض تم سے کافر ہیں اور بعض مسلمان ہیں۔ اور ایسی بہت سی آیات ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نیک و بد کا پیدا کرنے والا ہے۔ نور، اندھیرا۔ دونوں کا خالق وہی ہے۔ شر و خیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَ

اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ط قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔ نیکی انہیں پہنچتی ہے ۔ تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور کوئی برائی پہنچتی ہے ۔ تو کہتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہے ۔ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ۔

غرض تکوین میں نیکی خود نیکی ہے لیکن بدی بھی تکوین میں نیکی ہے ۔ کیونکہ خود خالق سراسر نیکی ہے ۔ اور صرف نیکی کی پیدائش اس سے ظہور پکڑے گی ہمارے آپ کے نزدیک تو نیکی اور بدی کی تمیز اپنی اضافت سے ہے لیکن یہ اضافیہ چھوڑ دیا جاوے ۔ تو ساری دنیا اور اس کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط کہہ کر اسے حق قرار دیا جاتا ہے ۔ اس کی مثال یوں خیال کیجئے ۔ کہ مسجد و محراب اور اس کے ساتھ بیت الخلا (پاخانہ) بیت الطہارت (غسل خانہ) عام ضرورت کے مطابق ایک درجہ رکھتے ہیں ۔ کیونکہ طہارت خانہ نہ ہو ۔ تو مسجد میں داخلہ کیسے ہو لیکن جب عام ضرورت کو چھوڑ کر دیکھا جائے ۔ تو مسجد و محراب کو پاک اور غسل خانہ اور ٹٹی کو پلید خیال کیا جاتا ہے ۔ دنیا میں جو شر ہے ۔ وہ بھی حقیقتاً خیر کو پروان چڑھانے کے لئے ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (کہ موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں دیکھا جاوے کہ کونسا اچھا عمل کرتا ہے) اب اگر شر نہ ہو ۔ تو پھر یہ امتحان کیسے ۔ تو معلوم ہوا کہ شر کی بھی اتنی ہی تکوین میں ضرورت ہے جتنی خیر کی ۔ کیونکہ یہ صفات متقابلہ ہیں ۔ اور ایک کے بغیر دوسرے کی تمیز مشکل ۔

شیطان الرجیم بڑا مردود ہے لیکن اس کے سوا دنیا تمام بے رونق ہے۔ تمام رونق بازی دنیا کی اسی مردود سے ہے۔ جب ایسا ہے۔ تو اس کو کیوں بُرا کہا جاوے۔ گو ہمیں حق ہے کہ اس کو بُرا کہیں۔ کیونکہ ہمیں دھوکے دیتا ہے۔ اور رب کریم جیسی ہستی سے ہماری توجہ ہٹاتا ہے۔ لیکن آخر اُس نے بھی تو کسی مصلحت عامہ کے لئے اسے پیدا فرمایا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک سوال کہ شیطان کیوں پیدا کیا گیا

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہیہ میں عرض کیا۔ کہ الٰہ العالمین! ہر چیز کی ضرورت ہے لیکن اس شیطان لعین کی کیا ضرورت تھی۔ مولیٰ کریم نے فرمایا۔ کہ اگر اس کی ضرورت نہیں۔ تو ہم اسے تمہاری قید میں دے دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ قید ہو کر آپ کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ حضرت سلیمانؑ زنبیلیں بنایا کرتے تھے۔ اور اس کی فروختگی پر گذران تھی۔ سبحان اللہ کتنے بڑے بلند بادشاہ کہ ہوا تخت اڑائے پھرتی ہے۔ لیکن اپنی کمائی سے گذران رکھتے ہیں۔ لیکن جس دن سے شیطان قید میں آیا۔ کوئی زنبیل فروخت نہ ہوئی۔ آخر تین دن گذر گئے۔ فاقہ نے تنگ کیا۔ تو بارگاہِ الٰہیہ میں عرض کیا۔ کہ آج تیسرے دن سے بھوکا ہوں۔ کوئی زنبیل فروخت نہیں ہوئی۔ جواب آیا۔ کہ کیسے فروخت ہوں۔ جبکہ فروخت کنندہ تمہاری قید میں ہو۔ کیونکہ دنیا کا تمام کھیل اس سے چل رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو یہ تمام کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔ حاکم۔ بادشاہ۔ رعایا۔ راعی۔ نبی۔ شادی وغیرہ وغیرہ امورات کی اسی وجہ سے ضرورت ہے۔ کہ یہ

دنیا میں فساد قائم کرتا ہے۔ اور لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ ورنہ فساد نہ ہو۔ اور گمراہی نہ ہو۔ تو پھر انبیاء اور اولیاء کی کیا ضرورت۔ غرض تکوینی صورت میں کوئی چیز بری نہیں۔ ہر چیز نفع سے پر ہے۔ کتا برا ہے لیکن کتے کے منافع بھی ہیں۔ شراب بری ہے لیکن خود قرآن حکیم شاہد ہے۔ کہ اس کے اندر منافع بھی ہیں لیکن نفع سے ضرر زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے حرام قرار دی گئی۔

تشریع

دنیا کی پیدائش کے لئے تو قانون تکوینی سے کام چلتا ہے لیکن دنیا کے نظام کے لئے تشریع کی ضرورت ہے۔ یہاں نیکی بدی کی تمیز ضروری۔ لَا يَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط یعنے نیکی بدی برابر نہیں۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ہ آپ کہہ دیجئے۔ کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر۔ یا اندھیرا اور نور برابر ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ہ (سایہ اور گرمی برابر نہیں) قانون اس نظام میں اگر یہ فرق ہٹا دیا جائے تو تمام انتظام دنیا ایک دن میں تباہ ہو جائے گا۔ اور دنیا چل نہیں سکتی۔ اس لئے خود قانون خلقت کے مطابق مولائے کریم اپنے منشاء قدرت کا ظہور فرماتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے احکام کے ذریعہ اپنے قانونِ انتظام کو جاری فرماتے ہیں۔ پہلے علم کو علم باطن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے کو علم ظاہر یا شریعت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پہلے علم کی عنایات الہامات سے ہوتی ہیں۔ اور دوسرے علم کی وحی کے ذریعہ تعلیم

ہوتی ہے۔ پہلے میں واسطہ نہیں۔ اور یہاں واسطہ۔ جن کو پہلے علم باطن دیا جاتا ہے۔ ان کو نبوت سے سرفرازی بخشی نہیں جاتی۔ کیونکہ وہ انتظام ظاہر سے قاصر ہوتے ہیں۔ نبی ظاہری شریعت کو پہلے چلاتا ہے۔ بعد میں حقیقت پر جاتا ہے۔ اگر علم لدنّی سے موسٰے علیہ السلام کو پہلے واقف کر دیا جاتا۔ تو فرعون سے ان کی کیسے اٹھنتی۔ اور کیونکر بنی اسرائیل کو خلاصی دلائی جاتی۔

موسٰے علیہ السلام کوہ طور پر جاتے ہیں۔ ہمکلامی خدائے قدوس سے مشرف ہوتے ہیں۔ اور پھر ظاہری آنکھوں سے دیدار کے طالب ہوتے ہیں لیکن ایک ہی جلوۂ الٰہی سے بے ہوش گر جاتے ہیں۔ واپس آتے ہیں۔ تو امت کو بچھڑے کی پرستش میں مصروف پاتے ہیں۔ غصّے میں آ کر الٰہی تختیاں پھینک دیتے ہیں اور اپنے بھائی ہارون کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ اور جب ستّر آدمی قربان کراتے ہیں۔ اور بجلی ان پر گرتی ہے۔ تو برملا کہہ دیتے ہیں۔ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ۔ اے رب میرے! اگر چاہتا تو ہلاک کرتا ان کو پہلے اور مجھ کو بھی۔ کیا ہلاک کرتا ہے تو ہم کو ساتھ اس چیز کے کہ کیا بےوقوفوں نے ہم سے۔ نہیں یہ مگر فتنہ تیرا۔ یعنے آزمائش تیری۔

خود سوچئے اگر تکوین کے راز کھلے ہوتے۔ تو ایسے بے ادبانہ الفاظ کیوں بارگاہِ رب العزت سے کہے جاتے۔ اور قدرت ربی کی حکمتیں سامنے ہوتیں۔ تو کیوں اتنے غضب ناک ہوتے۔ اور کیوں بھائی ہارون کی بے عزتی کرتے۔ ان کا کیا قصور تھا۔ وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ تم کچھ نہیں چاہتے۔ مگر جو اللہ تعالٰی

چاہتا ہے۔ یہ تکوینی الفاظ جس نے سُنے ہوں۔ اور جو اس حقیقت عظمٰے سے واقف ہو۔ بھلا وہ کیسے اتنی پریشانی ظاہر کرے گا۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں۔

کی بھروسا اس آشنائی دا

ڈر لگدا ئے بے پرواہی دا

(یہ ہے تکوینی حال)

فرعون کی کیا مجال تھی۔ کہ موسٰے علیہ السلام کی نبوت کا منکر ہوتا۔ اور سرِ تسلیم خم نہ کرتا۔ لیکن موسٰے علیہ السلام کے معجزے کیونکر ظاہر ہوتے۔ اور کیونکر بنی اسرائیل کے ایمان کی تقویت ہوتی۔ جوں جوں اس طرف انکار ہوتا گیا۔ توں توں دوسری طرف سے معجزات پیش ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کئی لاکھ بنی اسرائیل کے ایمان پختہ ہو گئے۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ موسٰے علیہ السلام کے فرمان پر وہ گھر بار چھوڑ آوارۂ دشت وصحرا ہوتے۔ اور کیونکر فرعون کی ہلاکت دنیا کے لئے ایک نمونہ بنتی۔ یہ سب تکوینی معاملہ تھا۔ جس سے ایک تشریع پھوٹ نکلی۔ اور ایک مرسل اپنے پورے شان و شوکت سے دنیا میں جا چمکا

نسبتِ عیسوی اور موسوی کا فرق

موسٰی علیہ السلام فطرتاً تشریعی تھے۔ پیدائش بھی تشریعی تھی۔ اگرچہ پرورش اور تربیت میں تکوینی سے واسطہ پڑا لیکن پھر بھی وہ اس سے متاثر نہ ہوتے تھے طبیعت میں جلال تھا۔ جو موافق مزاجِ تشریع تھا۔ تکوین سراسر نیاز ہے۔ اور جمال ہے ۔ عیسٰے علیہ السلام کی فطرت اور پیدائش تکوینی تھی یعنی بن باپ پیدا ہوئے۔ بچپن میں

بول اُٹھے۔ پرورش جمالی تھی اور تشریعی لیکن اپنی تکوینی نسبت سے وہ پرندے بناکر اڑاتے رہے۔ اندھوں کو بینا بناتے چلے گئے۔ اور مُوتی کو زندگی دلائی۔ کسی سے لڑے نہیں جھگڑے نہیں۔ جہاد کے لئے تلوار تو کجا ہاتھ تک نہیں اٹھا۔ بلکہ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو اپنا منہ سامنے کر دیا۔ لیکن موسٰی علیہ السلام باوجود ایک بھاری سلطنت بنانے کے دنیا میں اتنے روشن نہ ہوئے۔ جتنا کہ عیسٰے علیہ السلام۔ یہودی دنیا میں ہمیشہ کی زندگی ذلّت سے بسر کر رہے ہیں۔ اور عیسائی اُس وقت سے لیکر آج تک باعزت سلطنتوں کے مالک چلے آتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ وہی فرق نسبتِ تکوینی و تشریعی کا۔ یعنے توحید ذاتی و توحید صفاتی کا۔

قرآنی توحید

قرآنی توحید ایک ممزوجہ (آمیزش یافتہ) توحید ہے۔ ایک سرا توحیدِ تکوینی میں ہے۔ اور دوسرا سرا توحیدِ تشریعی میں۔ خالق کی طرف سے سراسر تکوینی ہے۔ اور رسالت کی طرف سراسر تشریعی ہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ فرمائیے۔ ہر جگہ یہ امتزاج اتنا خوبصورت ملتا ہے۔ کہ ایک کو ایک سے جدا نہیں کیا جاتا۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ ط وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ہ تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے۔ اللہ علم والا اور حکمت والا ہے جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت میں لے لیتا ہے۔ اور ظالموں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (سورۂ دہر کی آخری آیات) غور کریں۔ ایک آیت میں چار ٹکڑے ہیں۔ پہلا اور

تیسرا تکوینی (ذاتی توحید) ہے۔ اور دوسرا اور چوتھا تشریعی یا صفاتی۔

فہمِ قرآن

فہمِ قرآن کے لئے ضروری ہے۔ کہ تکوین اور تشریع پر برابر کی نظر ہو! ور ایک وقت ایک مسلمان دونوں توحیدوں سے فطرتاً مناسبت رکھتا ہو۔ اور دونوں توحیدوں سے بہرہ ور ہو۔ جو عالم مقامِ تشریع سے آگے نہ گذرے وہ اپنے مسلکِ توحید میں کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک اپنے اندر ذوقِ توحیدِ تکوین سے نہ پیدا کرے گا۔ اور تکوینی صوفی صفاتِ الٰہیہ سے روشن نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ لباسِ شریعت سے آراستہ نہیں ہوتا۔ گو تکوینی توحید کے بلند مقام پر کمتنا بلند ہوکر چمکے۔

لفظی توحید

لفظی توحید کوئی قدر اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی اس توحید پر توحیدی ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ توحیدی ثمرہ کیا ہے؟ یہ کہ نفوسِ انسانی میں خود بخود جذب ہوتا جائے۔ اور کسی کو سرتابی کی مجال نہ رہے۔ صاحبِ توحید کی آنکھ کا وار اس کے ہاتھ کے وار سے تیز ہو۔ اور اس کے دل کا زور اس کی زبان کے زور سے زیادہ ہو۔ بلکہ زبان گنگ ہو لیکن دل روشن اسرارِ الٰہیہ کی شعاعیں باہر پھینک رہا ہو۔ اور ایک دنیا مسحورِ نگاہِ ناز و نیاز ہو۔

علمی توحید

علمی توحید علما کی، موجودہ وقت لفظی ہونے کی وجہ سے بے اثر ہے۔ کتنے

وعظ ہو رہے ہیں۔ کتنے درس قرآنی شروع ہیں۔ جو نفوس اپنا دل لے کر حاضر ہوتے بھی ہیں۔ وہ بھی اُٹھتے ہیں۔ تو سر اٹھائے ہوئے۔ آنکھیں ہیں تو بے باکانہ اِدھر اُدھر پھرتی ہوتی ہیں۔ دل ہیں تو سراسر خواہشوں سے پُر اور پریشان۔

خضرؑ و موسیٰؑ کا قصہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے آیا ہے

یہ قصہ خضرؑ و موسیٰؑ ہمیں تعلیم دینے کے لئے ہمارے سامنے رکھا گیا ہے۔ کہ ہر صاحب علم کو تشریعی توحید سے ایک قدم توحید تکوینی یا ذاتی کے لئے بڑھانا ضروری ہے۔ اور اس کے لئے جیسے معلم کتاب کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ایک مربی اور مرشد کی ضرورت ہے۔ اب آیات مندرجہ بالا کی نشاندہی کر کے موقع بموقع نتائج پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ تحریر بالا کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

۱۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِىَ حُقُبًا ۝ طلب جستجو۔ اور عزم کامل کا نمونہ آیتہ بالا دیتی ہے۔ کہ سالک جب ہدایت ربی کے لئے نکلے۔ تو تمام تعلقات کو چھوڑ کر چلے۔ اور اپنی ہمت اتنی رکھے۔ کہ سالوں گذر جاویں لیکن مقصد حاصل کئے بغیر نہ ہٹے گا۔ موسیٰ علیہ السلام کو امر ربی ہُوا۔ کہ آپ ہمارے خاص بندے کی تلاش میں چلیں۔ اور غالباً مجمع البحرین کا نشان بھی دیا گیا۔ آپ کے خادم یوشع بن نون تھے جو آپ کے بعد خلیفہ ہوئے۔ اب بھی دستور ہے۔ کہ جب ولی اللہ لوگ کسی خاص تربیت کے لئے چلتے ہیں۔ تو وہ اپنا ایک خاص خادم (درویش) ساتھ کر لیتے ہیں۔ خدمت

کے سوا رفاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس سے بڑھ کر حبس نعمت کے لئے وہ جا رہے ہیں۔ اس سے اپنے شاگرد کو بھی سیراب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موسیٰؑ کوئی عام آدمی نہیں۔ خدائے قدوس کے برگزیدہ اولوالعزم مرسل صاحب کتاب تورات ہیں۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝ قدرتِ خدا اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں کی نشاندہی مولائے کریم نے فرمائی تھی۔ اور مچھلی جو کہ اپنے کھانے کے لئے بطور زادِ راہ اپنے پاس تھی۔ ایک پتھر پر رکھی لیکن چلتے ہوئے آپ کے خادم حضرت یوشع نے تو پالیا۔ کہ مچھلی کہیں نکل گئی ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ سوتے تھے۔ دل میں کہا جب اٹھیں گے تو کہدوں گا لیکن جب بیدار ہوئے۔ اور چلنے لگے۔ تو بھول گئے

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ۝ حضرت جب بہت کچھ دُور نکل گئے۔ اور تھک کر چور چور ہو گئے۔ تو فرمایا کہ کھانا لاؤ۔ کہ ہم اس سفر سے بہت ماندہ ہو گئے ہیں۔

قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۝ کہ جب پتھر پر بیٹھے تھے۔ تو اس وقت میں مچھلی کو بھول گیا تھا اور شیطان نے مجھے بھلا دیا۔ کہ آپ سے ذکر کرنا۔ وہ تو دریا میں چلی گئی ہے عجب طریقہ سے۔ بھول جانا بھی اللہ کی حکمت تھی۔ کہ ایسے سفروں میں مجاہدے دیئے جاتے ہیں۔ اور تکالیف سے طبیعت کی تیزی کو ٹھنڈا کرنا مقصود ہوتا

ہے۔ نہ بھولتے تو لمبا سفر نہ کرنا پڑتا۔ اور کوئی مشقت اٹھانی نہ پڑتی۔ اور اس نعمت کی قدر نہ ہوتی جس کے لئے گھر سے نکلے تھے۔

کرامت کی حقیقت

مچھلی مُردہ کا بھاگ نکلنا۔ زندگی کے سوا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور یہ تھی کرامت اس عبد صالح کی جس کی خدمت میں حضرت موسٰے حاضری کے لئے جا رہے تھے۔
مولیٰ کریم اپنے خاص بندوں کو جب عزت بخشتے ہیں۔ تو ان کی عزت افزائی کے لئے ایسے امور ظاہر فرماتے ہیں۔ جو عام طور پر کرامت کے نام سے مشہور ہوتے ہیں۔ اور جو عقل سے بالا ہوتے ہیں۔ یہ ایک خاص نشان ہے۔ جو مولےٰ کریم اپنے بندوں کو دوسرے عوام سے ممتاز فرمانے کے لئے عنایت فرماتے ہیں۔

موسےٰ علیہ السلام نے جب یہ واقعہ سُنا۔ کہ مچھلی زندہ ہو کر بھاگ گئی۔ تو فوراً تاڑ گئے۔ کہ وہی مقام تھا۔ جہاں مجھے اس بندۂ خاص کو تلاش کرنا تھا۔ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ۔ یہی جگہ ہے جس کی تلاش ہمیں تھی۔ چنانچہ واپس اپنے پاؤں پر لوٹے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ٥ تو اس بندۂ خاص کو پا گئے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اکرام فرما رکھے تھے۔ اور جسے اپنا علم خاص دے رکھا تھا۔ سُبحان اللہ۔
مولائے کریم نے کیا تعریف حضرت خضر کی فرمائی۔ پہلے فرمایا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا ہمارے خاص بندوں سے ایک خاص بندہ ہے۔ پہلے عَبْدًا کی تنوین سے

تعظیم و تفخیم کا اظہار فرمایا۔ پھر مِنْ عِبَادِنَا کی قید لگا کر اور شان بلند فرمایا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرما دیا۔ کہ ہمارے کئی مخلص بندے اور بھی اس قسم کے ہیں۔

یاد رہے۔ کہ عبد کا لفظ منصب و اخلاص خدائی کے لئے نہیں۔ اکثر انبیا کو اس لفظ محبوب سے سرفرازی بخشی گئی۔ نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسیٰؑ۔ ہارونؑ۔ الیاسؑ (سورۂ والصافات) سلیمانؑ۔ داؤدؑ۔ ایوبؑ (سورۂ ص) کو سرفراز فرمایا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر گو پیغمبر نہ تھے لیکن درجہ میں کچھ کم بھی نہ تھے۔

یہ الگ بات ہے۔ کہ موسےٰ علیہ السلام رسول اور نبی تھے۔ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے اور وزیر وزیر، خواہ وزیر کا علم بادشاہ سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ عام سوال ہے۔ کہ موسےٰ علیہ السلام ایک نبی تھے۔ وہ غیر نبی کے پاس کیسے بھیجے گئے۔ جس کے جواب میں کہا جاتا ہے۔ کہ علم میں تو موسیٰؑ بلند تھے لیکن ایک خاص علم کی تعلیم کے لئے۔ بیشک ایسے بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر خضری علم موسوی علم کے برابر مان لیا جاوے۔ یا زائد ہی تسلیم کر لیا جاوے۔ تو پھر موسوی رتبہ اور منصب میں کیسے کمی آ سکتی ہے؟ استاد رعایا ہوتا ہے۔ اور بادشاہ شاگرد ہوا کرتے ہیں۔ خود موسیٰ علیہ السلام جب حاضر ہوئے۔ تو خضر سوئے ہوئے تھے۔ جب کپڑا اٹھا کر دیکھا۔ تو فرمایا۔ اِنّٰی بِاَرْضِكَ السَّلَامُ۔ آپ پر سلام ہو۔ آپ اپنی زمین میں ہیں۔ یعنے میں ایک امت کا آدمی ہوں۔ پھر اس پر بس نہیں۔ فرماتے ہیں۔ وَاٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا۔ کہ ہم نے اس کو اپنی رحمتِ خاصہ سے بھی سرفرازی دی۔ رحمت کے معنے فضل و کرم کے سوا اور کیا ہوں گے یعنی بڑے فضل و کرم کے آپ مالک ہیں۔ اس کے بعد وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاؕ

ہم نے اس کو اپنا علم خاص بھی دیا۔ ان الفاظ پر غور فرمایا جاوے۔

علم لدُنّی

یہ وحی کا علم نہیں۔ بلکہ یہ الہامی علم ہے۔ شریعت والے تو وحی سے علم کو بلند کہتے ہیں۔ اگر ایسے ہی ہو بھی ؟ لیکن اس علم لدُنّی کا کیا کہنا۔ جو بلا واسطہ مولیٰ کریم کی ذات سے کسی کو نصیب ہو۔ آج اس علم لدُنّی کے الفاظ پر اہل علم تمسخر اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ وحی کے سوا کوئی دوسرا علم قابل توجہ نہیں۔ نہ ہو لیکن قرآن حکیم خود اس کی بڑی قدر فرما رہے ہیں۔ اور موسٰے جیسے پاک ہستی اور بلند منصب رسول کو جس کی تعلیم کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ کیا اس قابل ہے۔ کہ ایک عالم دین مذاق اُڑائے۔

جہاں نبی ہوتے ہیں اور رسول۔ وہاں اس علم لدُنّی والے بھی ہوتے ہیں۔ اور جب ان کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک رسول کو ارشاد ہوتا ہے۔ تو پھر کیونکر کتاب اللہ اور کتاب الرسول کے عالم کو اس سے بے نیاز خیال کیا جا سکتا ہے۔ دراصل کتاب، وسُنّت کی تعلیم کامل ہی تب ہوتی ہے۔ جب یہ تعلیم شرعی تعلیم کے ساتھ تکمیل کی جائے۔ ورنہ نا مکمل ہے۔ کیونکہ شرعی تعلیم صفاتی توحید کا حصہ اور علم ہے۔ اور لدُنّی تعلیم ذاتی توحید کا حصہ اور علم ہے۔ اور جب تک اصل تک نظر نہ پہنچے شرع کی حقیقت نہیں کھلتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر اہل علم اپنے علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد اپنی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اہل طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اپنی اصلاح نفس اور تزکیہ کے لئے

سالوں ان کی خدمت میں رہے۔ اور پھر تسلیم کیا کہ جو کچھ پہلے تھا۔ وہ اس تزکیۂ نفس کے سوا بے کار تھا۔

موسوی تعلیم کو خضری تعلیم سے چار چاند لگ گئے۔ اور ظاہر و باطن ایک ہو گئے۔ دل کی آنکھ جب ظاہر آنکھ کے ساتھ اٹھا دیکھے۔ تو پھر کوئی حقیقت حجاب میں نہیں رہتی۔ بلکہ خود ذات عزّ اسمہٗ کی جلوہ گری دل و جان اور آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس وقت آنکھ نہیں دیکھتی۔ جب تک دل نہیں دیکھتا۔ لیکن جب دل دیکھتا ہے۔ تو باطن عیاں ہو جاتا ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ کے مطابق نورِ الٰہی صورۃ نوری میں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ مقام صرف آنکھ کو میسّر نہیں ہو سکتا۔

استاد کسی درجہ کا بھی ہو استاد ہے۔ اور شاگرد کے لئے لازم ہے کہ اس کی عزت کرے۔ بلکہ شاگرد کے ہزار بعد ار کے لئے بھی اُس کی توقیر واجب ہوتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام خواہ رتبہ میں کتنے ہی بلند ہوں۔ نبی ہوں رسول ہوں۔ اور بادشاہ۔ اور ایک امت کے والی لیکن جب خضر کے پاس آتے ہیں۔ تو خضر کیونکر اُن سے کم ہوں۔ اور کیونکر ان کا ادب ان پر واجب نہ ہو۔ پھر ظاہر و باطن کا فرق کتنا عیاں ہے۔ ایک علم ظاہر اور ایک باطن۔ بے شک ظاہر کے بغیر باطن کا جلا نہیں ہوتا لیکن باطن کے سوا ظاہر کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ روح باطن ہے۔ اور جسم ظاہر۔ روح اپنے ظہور کے لئے تو جسم کی محتاج ہے لیکن اپنے بقا کے لئے نہیں۔ اور جسم اپنے بقا کے لئے روح کا محتاج ہے۔ علم لدنّی اپنے ظہور کے لئے تو علمِ شریعت کا محتاج ہو سکتا ہے لیکن اپنی

ذات کے لئے نہیں۔ لیکن علم شریعت اپنی ذات کے لئے علم لدنی کا محتاج ہے۔ اس کے سوا وہ سراسر لفظ رہ جاتا ہے۔ اور اس کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

یہ خیال نہ کیا جائے۔ کہ موسٰے علیہ السلام پہلے سراسر علم ظاہر سے آراستہ تھے۔ اور وحی سے تعلیم لیتے تھے ہی نہیں۔ وحی کے ساتھ بلا وحی بھی نبیوں کی تعلیم ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہ ساتھ ساتھ نہ ہو۔ اور جلوہ ہائے الٰہی کی جھلک ان کے قلب پر اپنے جلوے نہ دے۔ تو یقین کی دولت کسی صورت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لئے ظاہری علم کے ساتھ باطنی علم برابر چلتا رہتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر ایسا ہے۔ تو پھر خضری تعلیم کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ کہ کسی ایک علم میں کمال ہوتا ہے۔ صاحبِ شریعت اپنے علم میں کامل ہوتے ہیں۔ اور صاحبِ باطن اپنے باطن میں کمال رکھتے ہیں۔ ورنہ کوئی بھی ایک دوسرے سے کلی طور پر خالی نہیں ہوتا لیکن تکمیل اسی میں ہے جس میں وہ کامل ہے۔ خضر اپنی تعلیم میں مکمل تھے۔ اور باطنی استاد ہونے کے قابل۔ اس لئے مولیٰ کریم نے حضرت موسٰے کو ایک خاص تربیت باطنی علم کے حاصل کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

میرے جد امجد حضرت غلام مرتضٰی رحمۃ اللہ علیہ نسبت تکوینی سے مشرف تھے۔ اور بچپن ہی سے یہ نسبت ظہور پذیر تھی۔ پڑھنے جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کی زمین پڑتی تھی۔ لوگوں کے مال مویشی چر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ اس زمین کا مالک کوئی نہیں۔ کہ سب کے مال مویشی چر رہے ہیں۔ آپ نے یہ سُن کر مویشیوں کی

طرف دیکھا۔ اور چلے گئے۔ بحکمتِ خدا جو مویشی چر رہے تھے سب مر گئے۔

آپ کے تربیتی مرشد حضرت غلام نبی صاحبؒ للّٰہی تھے۔ اصل بیعت حضرت غلام محی الدینؒ قصوری سے تھی تعلیم حضرت للّٰہی سے پائی تھی۔ اکثر جب کوئی معاملہ باطنی پیش آجاتا تھا۔ تو آپ ان سے دریافت فرماتے۔ ایک بار ایک مقدمہ غیر مقلدین میں چند عالم علاقہ ملزم تھے۔ جن میں ایک آپ بھی تھے۔ اور جہلم میں عدالت تھی۔ صاحب عدالت کا رویہ ہمارے علما کے برخلاف تھا۔ للّٰہ شریف سے حضرت للّٰہی رخصت ہونے لگے۔ تو آپ نے فرمایا معلوم نہیں اب قید ہوتے ہیں۔ یا خلاصی پاتے ہیں۔ کیونکہ حاکم کا رویہ ہمارے خلاف ہے۔ تو حضرت پیر بلویؒ پاس کھڑے تھے۔ جوش میں آکر فرمایا۔ آپ کو کون قید کر سکتا ہے۔ آخر وہی بات ہوئی۔ اور بری ہو کر گھر تشریف لائے۔

ایک بار وبا پھوٹ پڑی۔ اور للّٰہ شریف میں بہت لوگ مرے۔ آپ نے خط حضرت پیر بلویؒ کو لکھا۔ کہ پہلا خط جو آپ نے لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر پھاڑ دیا گیا۔ (اس وقت آپ کے ایک عزیز میاں بیمار تھے) اب اس عزیز کے بارے لکھا جائے اور ساتھ ہی یہ لکھا جائے۔ کہ ہمارے خاندان سے کس کس کی باری ہے۔ دیکھئے پیر مرید سے پوچھتا ہے۔ کیوں! صرف اس لئے کہ پیر جانتا ہے۔ کہ یہ عزیز اس نسبت کا مالک ہے۔

آپکے صاحبزادہ صاحب کی شادی ہوئی۔ ہر خادم کے لئے الگ الگ خدمت مقرر فرمائی گئی۔ ایک خادم نے عرض کیا۔ کہ حضور موسم برسات کا ہے۔ اور تو سب کچھ ہو جائے گا۔ اس کا کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا۔ بیربل والوں کو بلاؤ۔

چنانچہ آپ حاضر ہوئے۔ فرمایا۔ آپ کے ذمہ ہے۔ کہ جب تک شادی کے ایام ہوں مینہ نہ برسے۔ آپ خاموش چلے گئے۔ آپ کی عادت تھی۔ کہ خلوت میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے اس موسم گرما میں بھی آپ مسجد کے اندر کونے میں بیٹھ گئے۔ ایک رات عشا کو گھنے بادل آ گئے۔ اور آسمان سے قطرے برسنے لگے خادم دوڑتے ہوئے حضور کی خدمت میں گئے۔ کہ بارش ہونے کو ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہاں ہیں بیربل والے؟ ان کو جا کر کہو۔ جب انہیں کہا گیا۔ تو آپ نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیا بارش ہو رہی ہے؟ آپ باہر نکلے اور آسمان پر نظر ڈالی۔ فوراً بادل پھٹنے شروع ہوئے۔ اور اُسی آن مطلع صاف ہو گیا لیکن شادی کے بعد للہ شریف پر ایک سال مینہ نہ برسا۔ آخر لوگ تنگ آئے۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض باران رحمت کے لئے کی۔ آپ نے جھٹ فرمایا۔ کہ اوہ! میں نے تو صرف شادی تک ان سے کہا تھا۔ کہ بارش نہ ہو۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہمیشہ نہ ہو۔ آپ نے حضرت بیربلوئی کو خط لکھا۔ کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے تو بارش روکنے کے لئے نہ کہا تھا۔ آخر بارش ہوئی۔

حضرت بیربلوی خود فرماتے تھے۔ کہ ایک بار اللہ تعالیٰ نے میری بڑی عزت رکھی۔ کہ حضور نے کچھ بیر اور جو کے بھنے ہوئے دانے اور قدرے گڑ دیا۔ اور فرمایا رکھ دو۔ چنانچہ میں نے ایک گھڑے میں رکھ دیا۔ اس وقت آپ للہ شریف میں پڑھتے تھے۔ جب موسم گرما آیا۔ اور حضرت دھمنی کے سفر کے لئے تیار ہوئے۔ تو مجھے بلایا۔ اور فرمایا۔ میاں وہ امانت لاؤ۔ لیکن جب میں نے گھڑے میں ہاتھ ڈالا۔ تو اندر کچھ نہ تھا۔ حیران ہو کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کہ اب میں کیا عرض کروں۔ آپ فرمائیں گے کہ تو ہی کھا گیا۔ اتنے میں ایک عورت

آئی۔ اس نے بیر۔ اور دانے اور گڑ مجھے دے دیا۔ اور میں لے کر حاضر ہو گیا۔ اور پیش کر دیا۔
یہ ہے تکوینی یا اویسی نسبت۔

فرمایا۔ کہ ایک بار تو تیا زنبور نے میرے ابرو پر ڈنگ دیا۔ جب میں سبق کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے چہرے کو دیکھا۔ تو آپ نے تبسم فرمایا۔ لیکن قدرتِ خدا جب میں دوسرے دن سبق کے لئے حاضر ہوا۔ تو آپ کا ابرو بھی متورم تھا۔

مولوی محبوب عالم صاحب کو اپنے پیر و مرشد حضرت بیر بلوئیؒ سے بڑی محبت تھی۔ اور ان کے والد حضرت للّٰہیؒ کے مرید بھی تھے۔ مگر بعض وقت فرط محبت سے ایسی باتیں نکل جاتی تھیں۔ کہ شانِ حضرت للّٰہی میں گستاخانہ خیال کی جاتی تھیں۔ اور وہ بھی حاسدین حاشیہ آرائی کر کے زیادہ چمکاتے تھے۔ اس پر حضرت للّٰہیؒ حضرت بیر بلوئیؒ پر ناراض ہو گئے۔ کیونکہ آپ بہت ہی بارِ یک بین تھے۔ حضرت للّٰہی نے ایک خط بیزاری اور بریت کا بیر بل لکھ دیا۔ کہ نہ تم میرے مرید۔ اور نہ میں تمہارا پیر۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ اور تمہارا اجازت نامہ ختم۔ ہاں تم چاہتے ہو۔ کہ تعلق قائم رہے۔ تو از سرِ نو بیعت کرو۔ اور ایک ادنیٰ مرید ہو کر آؤ۔ جس کا جواب بڑی تواضع اور انکساری کے ساتھ عرض کیا۔ کہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ کہ مجھے دوبارہ اپنی سلکِ عقیدت میں لے لیویں۔ میں ہر طرح حاضرِ خدمت ہونے کے لئے تیار ہوں۔

ادھر محبوبِ عالم صاحب کو حضرت بیر بلوئیؒ نے بیزار نامہ لکھ دیا۔ کہ تم ہرگز بیر بل نہ آنا جب تک حضور راضی تم پر نہ ہوں۔ مولوی محبوب عالم صاحب بیمار

ہو گئے۔ مہینوں چارپائی پر پڑے رہے۔ اور اپنے والد قبلہ کو حضرت للّٰہیؒ کی خدمت
بھیجتے رہے۔ آخر راضی ہوئے۔ اور رضانامہ لے کر پیر بلؒ جب حضرت کی خدمت میں
حاضر ہوئے۔ تو مولوی صاحب قدموں پر سر رکھے رو رہے تھے۔ اور حضرت کے
آنسوان کے سر پر پڑ رہے تھے۔ اور ناز و نیاز سے کھلے جا رہے تھے۔

لیکن جب بادل ٹل گیا۔ اور حضرت راضی ہو گئے۔ تو حضرت قبلہ للّٰہیؒ کو
معلوم ہؤا۔ کہ سب حاسدین کی باتیں تھیں۔ حضرت پیر بلویؒ کا کوئی قصور نہ تھا۔
تو وہ پہلے سے بھی زیادہ با اخلاص ہو نکلے۔ اصل میں یہ تربیت جلالی کے انوکھے
راز اور انوکھی تربیت تھی۔ جو دوسرے کسی مرید کے حصہ میں نہ آئی تھی۔ محبوب عالم
صاحب نے اس جدائی پر پورا ایک دیوان فارسی میں لکھ دیا۔ جوں جوں اشتیاق
محبت اور سوز و گداز اندر کھولتا تھا۔ وہ بصورت اشعار باہر نکلتا تھا۔ یہانتک
کہ ایک علاقہ میں مولوی محبوب عالم کی دھوم مچ گئی لیکن بے چارے اپنے پیر
کی حیات میں فوت ہو گئے۔ مرنے سے پہلے ایک قصیدہ لکھا جس میں کہا۔
کہ اگر آپ میری قبر پر آئیں گے۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ میں لحد کے اندر
سروقد تعظیم کے لئے کھڑا ہوں گا۔ آخر یہ کیا ہے۔ یہ محبّت ہے۔ جو سراسر
خاک کو کندن بنا دیتی ہے۔ ؎

جائے کہ زاہداں بہزار اربعین رسند
مست شرابِ عشق بیک آہ مے رسد

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر فرمایا کرتے تھے۔ وہ تھی
پچاس کی اور بچہ سو کا۔ یعنے بعض وقت مرید پیر سے بڑھ جاتا ہے۔ تو تعجب

نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ مولیٹے کی تعلیم بلند تھی۔ یا خضری تعلیم زیادہ۔ ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔

اکثر دفعہ حضرت للّٰہیؒ اپنے متوسلین کو دنیاوی مشکلات کے حل کے لئے حضرت پیر بلوی کے پاس بھیجتے رہتے تھے اور آپ برابر یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ مفتی صاحب میانویؒ نے کسی آدمی کو قرضہ کی مصیبت سے نجات دینے کے لئے بھیج دیا۔ وہ تین دن رہا جب چلنے لگا۔ تو آپ نے پانچ روپے دے دیئے۔ وہ حیران۔ کہ میں تو ایک مصیبت کے ٹالنے کے لئے آیا تھا۔ حضرت نے یہ کیا شرمندہ کیا۔ لیکن حضرت کے جلال کی وجہ سے کچھ عرض نہ کر سکا۔ آخر مفتی صاحب کی خدمت میں جب حاضر ہوا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔ تو پانچ روپے نکال کر رکھ دیئے۔ کہ اور تو آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ یہ پانچ روپے دیئے ہیں۔ مفتی صاحب تاڑ گئے۔ فرمایا ساہوکار کو بلاؤ۔ جب حاضر ہوا۔ تو کہا اس کا حساب چکاؤ۔ ساہوکار نے بھی کے پنے بہتیرے الٹ پلٹ کئے۔ لیکن پانچ روپے کے سوا کوئی باقی نہ تھی۔ وہ دے دیئے۔ اور لکیر کھینچ دی گئی۔

اس نسبت کے کرشمے بڑے بڑے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ شاہ و گدا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر مجاذیب اس نسبت سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیاوی امور میں تو یہ نسبت بادشاہ ہوتی ہے۔ کن فیکون کا نمونہ دکھاتی ہے۔ اور ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔

مولوی محمد عظیم نے خط لکھا۔ کہ چوہدری نے مسجد سے توت کاٹ لیا ہے۔ جواب میں لکھا۔ کہ جس نے مسجد کا توت کاٹا۔ اس نے اپنا گلا کاٹ دیا۔ ایسے ہی ہوا۔ کہ وہ فوراً ہی مر گیا۔

احمد یار ضلع گوجرانوالہ کی گلی میں حضرت قبلہ پیر بلوی کھانا کھانے کے

لئے جا رہے تھے۔ ہولی کی رات تھی۔ ایک چھٹنی (ہوائی) آپ کے پاؤں پر آ گی۔ آپ نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ہندو لڑکے سے چھوٹی تھی۔ تو رات ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ وہ لڑکا مر گیا۔

ایک دفعہ آپ باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ کہ ایک کتا بھونکتے بھونکتے پیچھے ہو گیا۔ لیکن جب قریب پہنچ گیا۔ تو آپ نے مڑ کر دیکھا۔ کتا وہیں بیٹھ گیا۔ اور پھر جب تک زندہ رہا۔ وہ نہ بھونکا۔

حضرت قبلہ پیر مہر علی شاہ صاحب کی بڑی دھوم ضلع شاہ پور میں تھی۔ آپ ایک بار تلی تحصیل خوشاب میں گئے۔ بڑے پرشکوہ استقبال ہوئے۔ اور بہت بڑا ہجوم آپ کی تشریف آوری پر ہوا۔ قاضی عطا محمد صاحب حضرت پیر بلویؒ کے خلیفہ بھی وہاں رہا کرتے تھے۔ جب حاضر ہوئے۔ تو پوچھا کہ پیر صاحب تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ بڑی دھوم مچی۔ اور بڑے لوگ زیارت کے لئے گئے۔ آپ نے پوچھا تم بھی گئے تھے۔ عرض کیا نہیں حضور۔ میں تو مسجد میں ہی بیٹھا رہا۔ نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا شاباش۔ اس کے بعد فرمایا۔ کہ آئندہ تلی نہ جاویں گے۔ چنانچہ تلی کے اردگرد تو آپ جاتے رہے۔ اور معتقدین لے جاتے رہے لیکن تلی میں پھر کسی نے آپ کو دعوت نہ دی۔ اور نہ آپ تشریف لے گئے۔

آئندہ کے حالات سے نہایت لطیف پیرایہ میں گاہ گاہ ارشاد فرما دیتے تھے۔ ایک بار کفری میں حضرت عثمانؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ حضرت بڑے تپاک سے ملے۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ خدام سے رخصت کے بعد

فرمایا۔ کہ آج ایک مرد نقشبندی دیکھا ہے۔ اور جب آپ سودھی اپنی ہمشیرہ صاحبہ کے پاس پہنچے۔ تو ہمشیرہ صاحبہ نے پوچھا۔ فقیر صاحب کو دیکھا۔ فرمایا۔ فقیر بڑے باکمال ہیں لیکن عمر کم ہے۔ چنانچہ اسی سال آپ رحلت فرما گئے۔

ایسے ہی مولوی قمر الدین صاحب نے ایک زمیندار کے لئے تعویذ طلب کئے۔ اور دعا کی التجا کی۔ آپ نے تعویذ ارسال کر دیئے۔ اور خط میں لکھ دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ شفا بخشے لیکن پیشانی صفحہ پر ج۔ ی۔ س۔ م لکھ دیا۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا تو پا گئے۔ کہ ہفتہ کو جوایا مر جائے گا۔ ایسے ہی ہوا۔

۔فرمایا کرتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شیشہ اور تلوار دیئے ہیں۔ جب کبھی کسی پر غیرت کی نگاہ پڑی تباہ ہو گیا۔ جب بھی آپ کے خاندان سے کسی نے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ تو نتیجہ اسکی ہلاکت ہوتا ہے۔ باوجودیکہ آپ کی یہ نسبت تکوینی اتنی بلند تھی۔ پھر بھی بہت بڑے شرع شریف کے پابند تھے۔ علوم ظاہریہ کا درس بھاری جاری کر رکھا تھا۔ اور کسی چندہ کے بغیر چلتا تھا عموماً اسّی۔ نوّے کے درمیان طلبہ رہتے تھے۔ اور ہر طرح کی ذمہ داری ان کی اٹھاتے تھے۔ میں نے بھی اپنی ابتدائی کتابیں آپ کی زندگی میں گھر پڑھی تھیں۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ اور آٹھ پوتے۔ سارے حافظ قرآن ہوئے۔ اور میرے والد صاحب اور دونوں چچا اچھے عالم تھے۔ اور کئی عالم بھی تعلیم دیتے تھے۔ کتب خانہ اتنا بھاری تھا۔ کہ مغربی پنجاب میں کوئی شخصی کتب خانہ اسکا نہ اس وقت مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ آج۔ لیکن قدیم کتب میں۔ مسجدوں کے سوا کوئی تعلیم پسند نہ فرماتے تھے۔ لیکن اپنی مسجد پرانی رکھی تھی۔ کہ تبرکاً یہی پسند رہی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اتنا جذبہ تھا۔ کہ صرف زبان تک اکتفا نہ تھا۔ بلکہ ضرورت پر بیدم (ہاتھ سے) کا معاملہ بھی ہو جاتا تھا۔ اور طلبہ چل پڑتے تھے۔

جب آپ پہلے پہل فارغ التحصیل ہوکر گھر تشریف لائے۔ تو اس وقت اس گاؤں بیربل میں سیدوں کا خاندان ممتاز تھا۔ لیکن بے علم تھے۔ ایک سید زادے نے ایک نٹنی سے ناچ کرایا۔ آواز آئی۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔ اصل حال عرض کردیا۔ آپ نے ایک درویش کو بھیجا۔ کہ ان کو منع کرو۔ لیکن جب درویش منع کے لئے اکھاڑے میں گیا۔ تو سید زادے نے ارشاد سن کر کہا۔ کہ ایہ لوک اساڈا ہے میاں دا نہیں۔ یعنے گاؤں ہمارا ہے۔ میاں کا نہیں۔ جب درویش واپس آیا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔ کہ کیوں ابھی تک آواز آرہی ہے۔ تو اس نے وہ الفاظ دہرائے۔ اس پر آپ کے منہ سے نکلا۔ کہ گاؤں نہ میرا نہ تیرا۔ بلکہ خدا کا۔ وہ دن گیا۔ اور آج کا آیا تقدیر اُلٹ گئی۔ سید خاک ہوتے گئے۔ عزّت کی جگہ ذلّت آگئی۔ دولت کی جگہ مفلسی نے قدم آرکھے۔ اور خاندان کے افراد تباہ ہونے لگ گئے۔ آج اس تمام خاندان میں صرف دو بچے ہیں۔ وہ بھی ان کے والد آئے۔ اور اپنی حالتِ زار کا ذکر کیا۔ اور آنسو برس رہے تھے۔ ساتھ ہی ان کی اس حالت سے ایسے متاثر ہوئے کہ آپ کے بھی آنسو پھوٹ آئے۔ اس روز کے بعد اس کے گھر کچھ حالت بدلی۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ نے دو سید زادے دیئے۔

غرض شریعتِ حقہ کا احترام جتنا میں نے آپ کی زندگی میں یہاں دیکھا۔ اتنا کسی خانقاہ۔ اور کسی مدرسہ اور کسی عالم کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔

ایک بار حضرت سجادہ نشین صاحب سیال شریف جناب خواجہ محمد دین صاحب چاچڑاں میں تشریف لائے۔ اور قوالی حسب عادت طریقہ چشتیہ کرائی۔ آپ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے ایک خط آپ کے نام بھیج دیا۔ جس میں لکھا

تھا۔ کہ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ جہاں شریعت کا کامل احترام ہے۔ آپ اپنے گھر میں جو چاہیں کریں لیکن آئندہ یہاں ایسے نہ ہو۔ سبحان اللہ۔ بزرگ بھی کیا حوصلہ مند ہوتے تھے۔ احباب حلقہ نے پوچھا۔ کہ کیا خط ہے۔ آپ نے کہا۔ کہ بھائی صاحب شریعت ہیں۔ جو چاہیں لکھیں۔ آپ کی خانقاہ خانقاہ نہ تھی۔ ایک مدرسہ دینی تھا۔ آپ کسی کو باطنی تعلیم کی ترغیب نہ دیتے تھے۔ اور نہ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ معمولی طور پر جو لوگ آجاتے۔ کچھ رسماً ان کی طرف التفات ہوتی۔ خود بڑا مطالعہ فرماتے۔ استفتا کے جواب دیتے۔ احکام شریعت بڑے زور سے جاری فرماتے۔ رمضان شریف کا بہت بڑا احترام ہوتا۔ خود حافظ تھے۔ عمر بھر کامل بیس رکعت تراویح روزانہ پڑھنا معمول تھا۔ آخری ایام جب آپ پر فالج گرا۔ تو پورے اڑھائی سال بیمار رہے۔ پانچوں نمازیں باجماعت ادا فرماتے۔ دور رمضان شریف خود میں نے قرآن حکیم آپ کی افتلاجی تراویح میں آپ کو سنایا۔ جبکہ آپ فالج کے بیمار تھے تیمم کے برخلاف تھے۔ ہر مرض میں آپ ہمیشہ وضو سے نماز ادا کرتے رہے۔ اور نبی کریمؐ کے اتباع میں کسی کو اپنا جانشین ظاہر طور پر الفاظاً مقرر نہیں کیا۔ ہاں عملاً اپنے بڑے صاحب زادہ صاحب یعنی میرے والد بزرگوار کو مصلّے پر کھڑا کر دیا۔ نہ خود کسی کی طرف دیکھتے نہ کوئی آپ کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ سراسر خاموش رہتے۔ مولوی محبوب عالم سوہاوی نے اس حال کا پنجابی میں کیا عمدہ نقشہ کھینچا ہے ؎

اوہ اک لحظہ جدا نہ ہووے رب تھئیں

رہے خاموش حیران اس سبب تھئیں

رہے مسجد دے اندر بیٹھا اوہلے
کدی باجھوں ضرورت دے نہ بولے
مدینے تک نہیں پہنچو جیدا
ویکھے وچ بیربل نائب نبیؐ دا

میں نے یہ حال اس لئے دکھلائے ہیں۔ کہ بعض حضرات کو یہ وہم نہ ہو۔ کہ تکوینی نسبت بے شرع ہوتی ہے۔ مجاذیب کے سوا باقی سب صاحب تکوین برابر صاحب تشریع بھی ہوتے ہیں۔ سر مو شریعت حقہ کے احکام سے تجاوز نہیں فرماتے۔ الا انشاء اللہ۔ جب ارشاد عز اسمہ ہو جاوے۔ تو پھر حسب ارشاد کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ صاحب علم اس نسبت شریفہ کے نام سے زیادہ گھبراتے ہیں۔ اس لئے اس کی توضیح کی ضرورت خیال کی گئی۔ ورنہ ناظرین کی ملالت کا خیال ضرور ہے۔

یہ اکادکا نسبت نہیں۔ حضرت قبلہ مرشدم میاں صاحبؒ کی بھی تکوینی نسبت تھی۔ جو حاضر ہوتا کوئی نہ کوئی کرامت دیکھتا۔ لیکن عملاً اتباع سنت کے سوا کوئی خیال نہ تھا۔ ہر آنے جانے والے سے اسی وجہ سے چھیڑ چھاڑ تھی۔ لباس ہو کہ نشست و برخاست۔ کھانا ہو۔ کہ سونا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ غرض سب کچھ شریعت کے موافق دیکھنا پسند فرماتے تھے۔ قمیص کا کالر دیکھا۔ تو پھاڑ دیا۔ کف نظر آئے تو پھاڑ دیئے۔ داڑھی منڈوا کر پیش ہوا۔ تو تھپڑ مارتے ایک طرف تھپڑ طمانچے اور پھاڑنا دیکھئے۔ دوسری طرف سنت کا جذبہ دیکھئے۔ یعنے کارگذاری نسبت تکوینی کی تھی۔ ورنہ ایک اتنا بڑا بزرگ کیسے ایسے افعال ناگوار کرنا پسند کرتا ہے۔ لیکن لطف یہ کہ ان کے طمانچوں میں بھی لذت تھی۔ ہر آدمی طمانچے کھا کر

بھی قدموں پر گرتا تھا۔ اور جانثاری کے جذبہ سے معمور تھا۔ امیر و غریب سے یکساں سلوک تھا۔ کھانے میں فقیروں کو امیروں کے ساتھ کھلاتے تھے۔ اور امیر کو فقیروں میں بٹھاتے تھے۔ یہ تھی وہ نسبت جس کی بدولت کائنات چل رہی ہے۔

ایسا ہی حال تھا غوث علیؒ کا۔ آپ تذکرہ پڑھیئے۔ توحیدی رنگ میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس دنیائے شریعت سے انسان آگے گذر جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کائنات کا خیر و شر سب خیر ہی خیر ہے۔

ے
ہر چہ آید در نظر از خیر و شر
جملہ ذاتِ حق بود اے بیخبر

لیکن جب ان کی عملی زندگی دیکھیئے۔ تو سراسر عبادت تھے۔ ایک آن بھی عبادت کے سوا نہ گذرتی تھی۔ اور شریعت پر استقامت تھی۔ جب آخری وقت قریب پہنچا۔ تو خدام سے کہا۔ کہ مجھے وہاں دفن کرنا۔ جہاں خدائی رحمت[1] کے سوا مجھے کوئی سہارا نہ ہو۔ اور کسی بزرگ کے پہلو میں دفن نہ کرنا۔ خادم نے عرض کیا کہ قلندر صاحب کے پہلو میں آپ کو دفن نہ کیا جائے؟ فرمایا زندگی میں کچھ وہاں سے نہیں ملا۔ تو موت کے بعد ان سے کیا ملے گا۔ حالانکہ تیس[۳۰] سال متواتر آپ کی خانقاہ میں فرائض کے سوا تمام نوافل ادا فرماتے رہے۔ اور مجاورت اختیار کر رکھی تھی۔ غور فرمائیے۔ کہاں سے کہاں تک یہ نکل جاتے ہیں۔

---

[1] ان لوگوں کو اعمال پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ صرف رحمۃ اللّٰہیہ پر ہوتا ہے۔ جس وجہ سے نڈر ہو جاتے ہیں۔ یہ فقرے سب کچھ ظاہر کر رہے ہیں۔ ۱۲

پھر اس بلند نسبت کو جب آپ دیکھیں گے۔ تقدیر مقدر سے کھیلتی نظر آئے گی۔ اور پوری مومن کی شان و آن دکھائے گی۔ اقبالؒ کا مصرعہ بالکل اسی کے مطابق نظر آتا ہے۔

"نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

موضع بیہرے تحصیل پھالیہ میں ایک ہندو فقیر کی کٹیا تھی۔ ایک تھانیدار صاحب مسلمان کا گذر ہوا۔ اور وہاں بیٹھ گیا خلقت ساتھ تھی۔ لیکن سائیں اپنی پوری استقامت سے بیٹھا رہا کچھ دیر کے بعد فقیر سے مخاطب ہوا۔ اور کہا۔ کہ یہ چرنوں گرنا کیسے۔ فقیر نے سر اٹھایا۔ اور کہا میں کون ہوتا۔ جس کے سامنے گر رہے ہیں جس کو گر رہے ہیں۔ گر رہے ہیں[1]۔ تھانیدار صاحب خاموش ہو کر رہ گئے۔

یہ قصہ اس لئے پیش کیا ہے۔ کہ کسی... مسلمان کے دل میں یہ خیال ایک گھڑی بھی نہیں آسکتا۔ کہ کوئی اس کے سامنے سر رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ وہ تو خود خدائے قدوس کے سامنے اس کا سر دیکھتا ہے۔ تاہم کبھی بھی حقیقی نسبت والے بزرگوں اور اولیاؤں نے یہ مشرکانہ طریقہ پسند نہیں کیا۔ بلکہ اپنے منتسلین کو روکتے رہتے ہیں لیکن جب اصلی نقشہ گم ہونے لگتا ہے۔ اور جانشین ادھورے مسند ارشاد پر بیٹھ جاتے ہیں۔ تو پھر واقعی تمام مشرکانہ فعل ظہور پکڑنے لگتے ہیں جس کے لئے جتنا واویلا کیا جائے کم ہے۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

جیسے سپیرا سانپ سے کھیلتا ہے۔ یہ نسبت اسی طرح تقدیر سے کھیلتی

---

[1] جد ہیں سنگت پیارے لائی   ہیں دیچ ہیں نہ رہ گئی کائی

ہے پپیرے کی موت بھی سانپ سے ہوتی ہے۔ آخر یہ بھی ایک دن تقدیر کے ساتھ ٹکرا کر چور ہوتی ہے۔ منصور، سرمد خود تقدیر تھے لیکن جب وقت آیا۔ تو تقدیر کے ہاتھوں سولی پر چڑھے لیکن جس سراپا بے خوفی سے چڑھے۔ یہ عشق ہی کی شان ہے اور لطف یہ کہ حق پرست علمائے کرام سے ایک حق پرست صوفی کو نصیب ہوئی۔ واہ تقدیراں تیریاں۔ یعنے تقدیر خود صاحب نسبت پر غالب آجاتی ہے۔ ہاں نڈر بڑی ہے۔ نہ موت سے ڈر ہے۔ نہ زندگی سے اسے لطف۔ موت وزندگی اس کے لئے یکساں۔ دنیا و آخرت اس کے سامنے برابر۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ[1] کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ اور ہر دم تازہ۔ کوئی بنے یا بگڑے یہ اپنے نشۂ توحید میں سرمست۔ اور پھر جب اس نسبت کے بزرگ مرتے ہیں۔ تو ان کی قبروں سے بھی نور توحید کے فوارے اٹھتے ہیں۔ قبر پرستی لعنت سہی لیکن حق پرستی کیوں نہ جلوے دے۔ دنیا آتی ہے۔ اور فیض پاتی ہے۔ حضرت داتا گنج بخش رحؒ کی قبر میں کیا رکھا ہے۔ رات دن قرآن دائیں بائیں پڑھے جا رہے ہیں۔ اور عبادت شرق و غرب میں ہو رہی ہے طواف ناجائز سہی لیکن کون رکے۔ برابر چکر پر چکر ہو رہے ہیں۔ کیونکہ صفت توحیدی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ بے شک ظاہراً شرک ہے لیکن حقیقت پر نظر ہو تو شرک کیسے۔ وہ تو فنا ہو چکے۔ اور فناء در فنا ہو چکے۔ جن کی پوجا ہو رہی ہے باقی ہے۔ تو صرف وہی جسے پوجا جاتا ہے۔ جس کی عبادت ہوتی ہے۔ اس صورت میں شرک کیسے لیکن شرعاً وہی حکم ہوگا۔ جو صاحب نسبت اپنی زندگی میں دیتے

---

[1] ہاں! اللہ کے دوستوں کو نہ تو کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ غم

تھے۔ کہ سب کچھ شرک ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔

تذکرہ ہونے کی مثال

عطارؒ دوکان پر بیٹھے تھے۔ایک فقیر آیا اور کہا۔ کہ مرنا نہیں۔آپ نے فرمایا کہ تم نے مرنا نہیں۔ کیسے مروگے۔ فقیر وہیں بازار میں چت لیٹ گیا۔اور پیالہ سرہانے رکھا۔دیکھا تو مرچکا تھا۔عطار رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھ کر دکان بند کی۔اور راہ مولیٰ اختیار کر کے الگ ہو بیٹھے۔یہ لوگ اس دنیا سے دوسری دنیا (آخرت) میں جانے کو انتقال مکان خیال کرتے ہیں۔اور فنا کو ہم جیسے نہیں سمجھتے۔یہی وجہ ہے۔کہ مرنا ان کے نزدیک کوئی پریشان کن اور مکروہ چیز نہیں۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔(اگر تم سچے ہو تو موت مانگو۔) کا مصداق ہو کر دنیا میں روشن ہوتے ہیں۔

نسبتِ تکوینی

تکوین۔کون سے ہے۔جس کے معنے "ہونا" کیا جاسکتا ہے۔مکان بھی اسم ظرف اسی سے ہے۔کونین (دو جہان)، لَا مَوْجُوْدَ فِی الْكَوْنَيْنِ اِلَّا هُوَ۔ سے کونین کے معنے واضح ہو جاتے ہیں تکوین جیسے نظم سے تنظیم ہے۔ایسے ہی کون سے تکوین۔تکوین بمعنے پیدائش۔یہ صفت اللہ ذات ربی ہے۔جس کے ذریعہ عالم کون و فساد پیدا ہوا۔اس سے پہلے گو ذاتِ ربی اپنی پوری آن بان سے موجود تھی لیکن اُس کے سوا کسی دوسری ہستی کو اُس کا علم نہ تھا۔اُسے خود اپنی جلوہ آرائی کے لئے آئینہ جمال نما کی خواہش پیدا ہوئی۔کہ اس کا جمال کتنا اچھا ہے

توصفت خلق یا تکوین کا ظہور فرمایا۔ اور دنیا آموجود ہوئی۔ باقی تمام صفات منشار کہ ہیں۔ یعنے سمیع۔ علیم۔ بصیر۔ وہ ذاتی طور پران صفات کا مالک ہے۔ اور ہم صفاتی طور پر یا انعکاسی طور پر ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں لیکن صفت خلق یا تکوین میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اور جن پاک نفوس کو اس کی قدرت فیاضہ یہ مہربانی فرمادے کہ اس صفت تکوینی کا علم حسب مقدر طبع انہیں عنایت فرمایا جائے۔ انہیں صاحب نسبت تکوینی کہا جاتا ہے۔ اور یہ نسبت تشریع سے ایک قدم بلند ہے۔ کیونکہ تشریع احکام اور نواہی الٰہی کا نام ہے۔ جو ہر صورت خلقت اور تکوین کے بعد آتے ہیں۔ کوئی نسبت تشریعی ایسی نہیں جو نسبت تکوینی سے خالی ہو۔ کیونکہ ذاتی نسبت کے سوا صفاتی نسبت کیسے قائم اور عارض ہو سکتی ہے لیکن بعض پر تکوین غالب ہوتی ہے۔ اور بعض پر تشریع۔ نری تکوین بے ہوش ہے۔ اور نری شریعت جسم بے جان۔ اس لئے ہر مذہب کے لئے علم تکوین بطور جان اور علم شریعت بطور جسم خیال کئے جاتے ہیں۔ اسلام میں یہ امتزاج بدرجہ اتم رکھا گیا ہے اور ایک دوسرے کو ایسے پیوستہ اور باہم جان کر دیا گیا۔ کہ ایک کو ایک سے جُدا کرنا مشکل ہے۔ قرآن حکیم پڑھیئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات مطالعہ کیجئے۔ ہر جگہ دونوں نسبتوں کی مساوات نظر آئے گی۔ اور ان نسبتوں کو جُدا کرنا۔ اور جدا دیکھنا اسلام نہیں۔ بلکہ کچھ اور ہے۔

نسبت۔ تعلق کا نام ہے۔ اور طریقت اور تصوف کی اصطلاح میں تعلق باللہ کا نام ہے۔ اور یہ کیف ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے احکام کی تابعداری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض فطرت سلیم روز ازل سے اس کیف کو لے کر عالم وجود میں آتی ہیں۔ یہی

لوگ پاک ہستیاں دنیا میں معروف و مشہور ہو کر دنیا کے لئے ہدایت کی علم بردار ہوتی ہیں۔ اور یہ صحیح نمونہ قدرت خدا ہو کر جلوہ گر ہوتی ہیں۔

نسبتِ خضری

خضر پر نسبت تکوینی کا غلبہ تھا۔ اور موسےؑ پر نسبت تشریع کا ظہور کامل تھا۔ جیسے پہلے لکھا گیا۔ اسی نسبت خضری یا تکوینی کے بلند مدارج دکھانے اور خاص بنا کی مصلحت پہ مولیٰ کریم نے حضرت موسےؑ کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے حضرت خضر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارشاد فرمایا۔ اور یہ سبق ہے۔ کہ صاحب علوم ظاہر یہ کو باطنی علوم حاصل کرنے کے لئے کسی صاحب تکوین کی خدمت میں حاضر ہو کر باطن کو مکمل کرنا چاہیئے۔ تا کہ یقین سے بلند مدارج پر کامیابی ہو۔ اور خلق اللہ کے رشد و ارشاد کی نظری منزل طے ہو تا کہ رشد و ارشاد کے اندر برکت پیدا ہو۔ اور دنیا یقین الہٰی سے پُر ہو۔ اور شک و کفر سے نجات پائے۔

خضری صورت

اس صورتِ خضری اور موسوی سے یہ پتہ بھی چلتا ہے۔ کہ بعض نفوسِ قدسیہ ایسے ہیں۔ کہ وہ اپنے کمال میں کامل و اکمل ہیں لیکن گمنام زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بعض رشد و ارشاد طریقت میں ممتاز ہونے کے باوجود ایک درویش کے علم کے محتاج ہیں۔ اس کی حکمت وہی جانتا ہے جس نے اپنی حکمتیں اور مصلحتیں کلی طور پہ کسی پر ظاہر نہیں فرمائی ہیں۔

بہر حال خضر کے اندر وہ تمام کمالات موجود تھے۔ جو نبیوں کے ہوتے ہیں جیسے خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کے برابر ہیں۔ انبیاء کو پہلے جس لفظ سے نوازا گیا ہے۔ وہ عبد ہے۔ اس کے بعد رحمت خاصہ کی عنایت ہے۔ اس کے بعد علم لدنّی کی نوازش۔ یہ نبیوں کے عنایات خضر کو نصیب ہیں۔ گو نبی نہیں لیکن نبی کے شان سے کم بھی نہیں۔ ایسے ہی بعض خاص بندے جن کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ایسے ہی جو مدارج میں بہت بلند ہیں لیکن دنیا کی آنکھ میں عام طور پر ظاہر نہیں۔ ہاں اکّے دُکّے ان کو جانتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی نہ جانے۔ تو یہ معشوقی کیسی۔ آخر کوئی تو عاشق ہو۔ اب پھر سلسلۂ قرآن حکیم کی طرف توجہ کریں۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت کو پا لیا۔ اور دل میں ان کے چہرے بشرے سے یقین پیدا ہو گیا۔ کہ یہی وہ مرد خدا ہے جس کی تعلیم طریقت کے لئے بھیجا گیا۔ تو آپ نے حضرت خضر سے عرض کیا۔ میں آپ کا تابعدار ہوتا ہوں۔ اگر آپ مجھے علم رُشد (طریقت کا علم) سکھا دیں۔ یا بتلا دیں۔

مرید و پیر یعنی مسترشد اور مرشد

مذکورہ بالا آیتہ میں وہ تمام چیزیں آگئی ہیں۔ جن سے علم دوست حضرات گھبراتے ہیں۔ مسترشد یا مرید۔ پیر یا مرشد۔ بیعت اور نسبت کچھ اور نہیں۔ یہی ہے۔ کہ مرید اقرار اور

عہد کرے۔ کہ وہ اپنے رہبر کی اطاعت اور فرماں برداری کرے گا۔ سو یہ موجود۔ اور اس علم کے لئے نہیں۔ جسے علم شریعت کہا جاتا ہے۔ بلکہ یہ رشد کچھ اور ہے۔ ورنہ حضرت موسےٰ علیہ السلام تو خود صاحب شریعت تھے۔ یہ بھی خیال نکل گیا۔ کہ شریعت کے سوا کوئی دوسرا علم نہیں۔ جو توجہ کے قابل ہو۔ بلکہ اس کی اہمیت خود قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اور اسکے سوا شریعت کا جامہ بے جان نظر آتا ہے۔

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ صرف ایک بیعت اسلام ہے۔ اور اس کے سوا کوئی دوسری بیعت نہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ بیعت اسلام کے سوا بیعت الرضوان بھی۔ جو خود قرآن حکیم کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ اقتدا اور اطاعت کی بیعت تو اسلام کے تواتر میں چلی آتی ہے۔ اور کسی زمانے میں اس کا انکار نہیں کیا گیا۔ یہ ایک معاہدہ ہے جیسے عام معاہدہ کو جب تک ظاہری لباس نہ دیا جائے۔ پختہ تصور نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح یہ اسلامی یا طریقی معاہدہ بھی ہاتھ میں ہاتھ دینے کے سوا پختہ تصور نہیں کیا جاتا۔ اور ایک گونہ سنت ہے۔ ورنہ جب دلی اقرار ہو جاوے۔ اور پیر اُسے قبول کر لیوے۔ تو بیعت ہو گئی۔ اور جب طبیعت کا نبھاؤ نہ رہے۔ تو سب ختم۔

رُشد

یہ ایک ایسا لفظ ہے۔ جسے نہ تو علم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ علم سے باہر۔ مفسّرین نے مختلف الفاظ سے اس کی تعبیر کی ہے۔ کامیابی کی راہ۔ بھلائی۔ حقیقت حال۔ قصہ زیر نظر میں حقیقت حال زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ زبانی تو کچھ سیکھا نہیں جائے گا۔

بلکہ عملاً جو کچھ کیا گیا۔ جو حضرت موسےٰ کے فہم میں نہ آیا۔ کیونکہ عقل کے فہم سے بالاتر تھا۔ اور ظاہر اُبڑا۔ لیکن جب آخر کار حقیقت حال کھول دیا گیا۔ تو حضرت موسےٰ کی تسلّی ہو گئی۔ اور اس حقیقت کو پا گئے۔ کہ ظاہر سے بڑھ کر ایک اور حقیقت بھی ہوتی ہے جسے ہر ایک پا نہیں سکتا۔ خصوصاً مولیٰ کریم کی حکمتیں اور مصلحتیں عقول انسانی اور فہم ادراک سے بالا ہیں۔ اور یہ فہم و ادراک جسے دیدے دیدے دوسرے کا اس میں حصہ نہیں

طریقت کے مجاہدے

طریقت کے مجاہدے اور ریاضتیں اسی رُشد کے حاصل کرنے کے لئے پیرو مرشد کی رہنمائی سے کی جاتی ہیں۔ اور پیر و مرشد کے انوار عکسی اور مجاہدۂ ریاضت کے انوار سے وہ مشاہدات سامنے آجاتے ہیں۔ جن سے بہت سی باتیں کھل جاتی ہیں۔ جن کے کھلنے سے اسلام کی نوری صورت سامنے آجاتی ہے۔ اور عقلی ڈھکوسلوں سے خلاصی ہو جاتی ہے۔ اور اس دنیائے فانی کے مقابلہ میں آخرت کا پہلو زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ ہر قدم منزل کے پانے کے لئے زیادہ مضبوط اور زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔

مجاہدے ریاضتیں نبیوں کی سنت اور طریقہ ہے

یہ خیال نہ کیا جائے۔ کہ یہ جو کیا نہ مجاہدے اور ریاضتیں ہیں۔ جیسے عام طور پہ کہا جاتا ہے۔ خود قرآن حکیم پڑھیئے اسوۂ حسنہ کا مطالعہ فرمائیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لمبی راتیں جاگنا۔ رات بھر عبادت میں گذارنا۔ پیٹ سے بھوکا

رہنا۔ روزے متواتر رکھنا۔ صوفیائے اسلام نے کوئی طریقہ ایسا تجویز نہیں کیا۔ جس کی بنیاد قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ سے نہ لی گئی ہو۔ صحابۂ کرام کے حالات پڑھیئے۔ وہ رات کو کھڑے ہوئے گذارتے تھے۔ اور آنسوؤں سے چہرے تر ہوتے تھے۔ سجدے اتنے لمبے ہو جاتے تھے۔ کہ ایک حصہ رات کا گذر جاتا۔ اور سر نہ اٹھاتے تھے۔ آج کون سورۂ بقرہ نماز میں پڑھ سکتا ہے۔ یا سُن سکتا ہے۔ لیکن لاکھوں بندگانِ خدا نے ایک بہت بڑا حصہ قرآن کا پڑھنا اپنے معمول میں کر رکھتے گذارا۔ علمائے کرام کا یہ ذوق تو ضرور ہے۔ کہ علم قرآنی کے تدبر و فہم میں گذارتے ہیں۔ وہ بھی بڑی عبادت ہے لیکن دونوں کے کیف اور نتائج الگ الگ۔ ایک کا واسطہ قلب سے ہے۔ اور دوسرے کا واسطہ عقل سے۔ قلب نورِ محمدی کا جلوہ گاہ ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ط لیکن عقل کو یہ رتبہ کہاں نصیب وہ اپنی عقلی زنجیروں میں جکڑ بند۔ اُسے نہ تو تسلی ہوئی ہے۔ اور نہ منزلِ مقصود پر پہنچنا جلدی سے ہو سکتا ہے۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کی طبعی حقیقت ان سے واضح کر دی۔ کہ آپ میرے ساتھ صبر سے چل نہیں سکتے۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ بھلا کیسے صبر کرو گے اس چیز پر جو تمہاری در حقیقت اور سمجھ سے باہر ہے۔ یہ کتنی واضح حقیقت فطرتی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ؎ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝ ؎ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ کیوں نازل ہوا اس لئے کہ مجاہدے میں زیادہ تکلیف اٹھاتے تھے۔ ۱۲

ظاہر فرمائی۔ اور ساتھ ہی حضرت موسے علیہ السلام کو کتنا بھانپ گئے۔ یہ تھی رُشد باکرامت خضری۔ بہر صورت ہوا وہ کچھ جو آپ نے فرمایا۔

لیکن موسٰی علیہ السلام نے فرمادیا سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعۡصِیۡ لَکَ اَمۡرًا۔ بڑی عزیمت سے عرض کیا۔ کہ یقیناً آپ مجھے صابر پائیں گے۔ اور کسی امر میں نافرمانی نہ کروں گا۔ لیکن اس پر پھر حضرت خضرؑ بول اُٹھے۔ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِیۡ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ حَتّٰۤی اُحۡدِثَ لَکَ مِنۡهُ ذِکۡرًا۔ کیا مزے کے سوالات جوابات ہو رہے ہیں۔ ہاں اگر تابعداری اختیار کرنے ہو۔ تو مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود اُسے بیان نہ کروں۔

طریقت کا معاہدہ

کیا طریقت کا معاہدہ یہی نہیں ہوتا؟ تابعداری کرو۔ حکم مانو لیکن کچھ نہ پوچھو۔ اگر سالک اس پر قائم رہتا ہے۔ تو کامیاب مرید ہوتا ہے لیکن اگر استواری قائم نہیں رہتی۔ تو پھر اسے بیرواگذار کر دیتا ہے۔ جیسے موسٰے علیہ السلام کو ھٰذَا فِرَاقُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنِکَ کہہ کر جُدا کر دیا گیا۔

تمثیلی حکایت

حضرت الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک خادم آپ کو وضو کرایا کرتے تھے۔ اور ایک مدت سے حضرت کی خدمت میں مقیم تھے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ وہ اپنے وقت کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ لیکن فقرا جب کسی کو طریقت کے منازل سے گذرنے

کا خیال فرماتے ہیں۔ اور سالک اس پر چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو سالک ایک بار
دنیاوی حالاتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور ذات ربی کے سوا اس کا کچھ مقصود
نہیں رہتا۔ لیکن نفسی خیال سر اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس خادم نے کسی اپنے ہم خیال
سے ذکر کیا۔ کہ اگر میری شادی فلاں سے ہو جائے۔ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اس لئے
موقعہ پا کر حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ آپ کے خادم کی خواہش ہے کہ اس کا
نکاح ہو جاوے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! کس سے چاہتا ہے عرض کیا فلاں خادمہ سے۔
آپ خاموش ہو گئے۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ صبح بعد نماز جب حلقہ سے آپ فارغ ہوئے
تو فرمایا دو مضبوط آدمی نکل آئیں۔ چنانچہ حکم پاتے ہی دو خادم حاضر ہو گئے۔ اس خادم کا نام
لے کر فرمایا۔ کہ اس کے کان پکڑ کر للہ شریف کی حد سے باہر چھوڑ آئیں۔ چنانچہ خادموں نے
کان پکڑ لئے۔ اور اس کو لے گئے۔ بعد میں آپ نے فرمایا۔ کہ کوئی اس کی سفارش میرے
پاس نہ کرے۔

لیکن جب دو چار سال گذر گئے۔ تو اس بیچارے کے حال پر کسی دوست اور رفیق
کو رحم آیا۔ اور اس نے موقعہ پا کر حلقہ کے بعد عرض کیا۔ کہ حضور کا خادم نہایت خستہ حال
ہے۔ اور بیچارہ مارا مارا پھرتا ہے۔ آپ رحم فرمائیں۔ آپ نے فوراً کہا۔ کہ میں نے یہ
نہیں کہا تھا۔ کہ اس کی کوئی سفارش نہ کرے۔ میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔
لیکن جب آٹھ سال میں عورت کا خیال میں اس کے ذہن سے نکال نہیں سکا۔ تو
مجھے نکالنا مشکل ہے۔ میں نے خیال کیا۔ کہ اب زیادہ وقت اس کا ضائع نہ کیا
جاوے۔ ورنہ مجھے اس سے محبت ہے۔ دشمنی نہیں۔

یہاں بھی خضر علیہ السلام کا هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ کہنے کی

وجہ یہی ہے۔ کہ اکٹھے گذرنی مشکل ہے۔ اور جو مقصود تھا۔ وہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ جیسے آئندہ بیان ہوگا۔

سید پیراں صاحب بھیروی ایک اسی قسم کے بزرگ تھے۔ اور عام سفر پر رہتے تھے۔ اور جہاں کہیں گزر ہوتا تھا۔ لوگ دعا کے لئے عرض کر دیتے تھے۔ عجب یہ ہے کہ فوراً دعا دیتے۔ اور اجابت ایسی ہوتی۔ کہ صدیوں بعد بھی اپنا اثر ابھی تک قائم چلا آتا ہے۔ خود ہمارے گاؤں بیربل میں جب آئے۔ تو لوگوں نے درخواست کی۔ کہ آپ ہمارے اتفاق کے لئے دعا کیجئے۔ کیونکہ اکثر ڈھاک کے لوگوں کے ساتھ ایک حد زمین ہونے کی وجہ سے مقابلہ رہتا تھا۔ آپ نے کہا۔ کہ ڈھول منگاؤ۔ لیکن اس وقت کوئی ڈھول میسر نہ ہو سکا فرمایا۔ تمہارا اتفاق مشکل ہے۔ چنانچہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ ان کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ اور وہ ڈھاک والے ان پر غالب رہے۔

ڈھاک پتن کے ملاحوں نے عرض کیا۔ کہ ہمارے پتن کے لئے دعا کیجئے۔ فرمایا سلامتی ہی سلامتی ہے۔ چنانچہ آج تک کبھی کوئی کشتی یہاں نہیں اُلٹی۔ اور نہ کبھی کوئی اس دریا میں غرق ہوا ہے۔ ایسی بے شمار کرامتیں ان کی مشہور ہیں۔ اور آج تک لوگ ان کے عقیدتمند ہیں۔ قبر صاحب برکت ہے۔ حضرت قبلہ میاں صاحب تشریف لائے جب مزار سے اٹھے تو فرمایا۔ مردہ بادشاہی کر رہا ہے۔ اور واقعی ہے بھی ایسے ہی چڑھاوے آج ملحد اور عقلمند دنیا میں بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے پہلے تھے۔ جب جاؤ دل اللہ اللہ کرنے لگتا ہے۔ اور دنیا سے بیزاری شروع ہو جاتی ہے۔

معاہدہ کے بعد سفر

معاہدہ طریقت ہونے کے بعد دونوں بزرگوار اکٹھے چلتے ہیں۔ تاکہ تعلیم رشد کے اسباق دیئے جاویں۔ فقر میں جو بھی سبق ہوتا ہے۔ زبانی نہیں ہوتا۔ بلکہ عملی اسباق ہوتے ہیں۔ اور ہر عمل میں مسترشد کے لئے سبق ہوتا ہے۔

فَانْطَلَقَا ﷺ حَتّٰی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْــًٔا اِمْرًا ۝ دونو جب چل نکلے تو ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ اور چڑھتے ہی حضرت خضر اسے پھاڑنے لگے۔ موسٰے علیہ السلام نے جب یہ دیکھا۔ تو بے اختیار بول اُٹھے۔ کیوں بھائی اس لئے پھاڑتے ہو کہ اس کے سوار غرق ہو جاویں۔ یعنے ہم لوگ۔ تو نے ایک بھاری کام کر رکھا ہے۔

کہتے ہیں۔ کہ جب یہ دونوں بزرگ تشریف لائے۔ تو کشتی والوں نے خضر کو پہچان لیا۔ کیونکہ اس بزرگ صورت سے لوگ آشنا تھے۔ ایسے تکوینی بزرگ اگرچہ عام طور پر مشہور نہیں ہوتے۔ اور نہ کوئی خاص مسند پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اور اکثر سفر ہی رہتے ہیں۔ لیکن موقعہ بموقعہ ان کے کرامات خود بخود ظہور پکڑتے رہتے ہیں۔ جس سے ان کی شہرت عامہ ہو جاتی ہے۔ چونکہ کرامات کا اثر عقول پر غالب آجانے کے لئے دلوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے دنیا میں ایسے لوگوں کی تعظیم و تکریم ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ اس کے فضل ہیں۔ کہ ایک تو اپنے خاص بندوں کی عزت بڑھاتے ہیں۔ دوسرا اس ذریعہ سے عام و خاص

کو ان کا نشان مل جاتا ہے۔ اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خضری صورت

حضرت خضر کو کسی نے دیکھا تو نہیں لیکن ان کے اس قصے اور دیگر روایات کی وجہ سے ان کے خصائل اور عادات ان کے چہرے پر اتنے واضح تخیل پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ جب کوئی نیک صورت فرشتہ حقیقت انسان سامنے آتا ہے تو لوگ بے اختیار کہہ دیتے ہیں۔ کہ یہ تو خضری صورت بزرگ ہیں۔ سو یہ خضری صورت کا ہی اثر تھا۔ کہ کشتی بانوں نے بغیر کرایہ ان کو سوار کر لیا اور پھر جب وہ کشتی پھاڑ رہے تھے۔ تو کسی کشتیبان نے واویلا نہ کیا۔ بلکہ جیسے عام ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ میاں فقیروں کے کام حکمت سے خالی نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں بھی موسٰے علیہ السلام کے سوا کسی نے شور اور واویلا نہ کیا۔ بلکہ حق تو ان کے لئے چیخنا چلانا پہلے تھا۔ مگر یہاں ایک تو طبع جلالی تھی۔ دوسرے منصب نبوت کے مالک بھی تھے۔ گو کتنے اقرار کئے تھے۔ کہ نہ بولوں گا۔ اور کتنے وعدے کئے تھے۔ کہ میں صبر سے چپکے رہوں گا۔ لیکن جب آپ نے خیال شریعت کے الٹ دیکھا۔ تو پکار اٹھے۔ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا۔ تم بڑی بھاری بات کر چکے ہو۔ ایک طرف موسوی فضیلت ہے لیکن دوسری طرف استادی سبق میں ناکامی ہے۔ اور وہی بات سچی ہو نکلی۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا۔ تم اس بات پر کیسے صبر کر و گے جس کو تمہاری سمجھ نہ پا سکے گی یعنی تمہاری سمجھ سے باہر ہو گی۔ چنانچہ عالم خضر نے وہی کہدیا۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ موسٰی علیہ السلام

کو اپنا وعدہ یاد آگیا اور اپنی بھول چوک کی معافی چاہی۔ اور کہدیا۔ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۝ ذرا بِمَا نَسِيتُ (میں بھول گیا ہوں) کو دیکھئے کتنے نرم الفاظ سے فرماتے ہیں۔ اور پھر لَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۝ (میرے کام پر تنگی نہ کیجئے گا) کہہ کر اپنی معذرت نہایت فصیحانہ طریقہ سے پیش کر دی جس پر خضر چپ ہو گئے۔ اور اپنا سفر شروع کر دیا۔

دوسرا سبق

فَانْطَلَقَا قف حَتّٰى إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ ۙ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ط لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ۝

جب چلے۔ تو ایک لڑکا سامنے آگیا۔ اور۔۔ عالم خضر نے اسے قتل کر دیا پھر موسےٰ علیہ السلام بول اٹھے۔ کہ ایک پاک جان کو بدلے بغیر تم نے قتل کر دیا۔ اب تو بہت بڑی مکروہ بات آپ نے کر ڈالی۔ پھر خضر علیہ السلام نے وہی کلمہ دہرایا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ صرف ایک "لَكَ" زیادہ تخصیص کے لئے بڑھا دیا۔ تاکہ خطاب میں زور پڑے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے ایک دوسری راہ معذرت لی۔ اور کہدیا۔ قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝ ایک تو معذرت کا طریقہ نہایت مؤثرانہ تھا۔ دوسرے خود ہی اپنے لئے فیصلہ کی راہ بھی تعین کر لی۔ کہ اس کے بعد مجھے الگ ہونے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔

خود سوچیئے۔ ایک نبی صاحب شریعت کس طرح ایسے مکروہ بلکہ حرام فعل پر خاموش رہ سکتا تھا۔ لیکن مرشد کے سامنے دم بخود ہو گئے۔ جب انہوں نے وعدہ یاد دلایا اور خود بھی تاڑ گئے۔ کہ میں ایسی تعلیم کے لئے اس عالم کے پاس بھی گیا ہوں چنانچہ معذرت خضر کے بجائے موسےٰ علیہ السلام کو کرنی پڑی۔

تیسرا سبق

فَانْطَلَقَا وقفۃ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ نِ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ط قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ہ

چلے اور گاؤں میں پہنچے۔ اور ان سے کھانا طلب کیا۔ لیکن وہ مہمان داری سے انکار کر گئے اتنے میں ایک دیوار گرتے دیکھی۔ تو حضرت خضر نے ہاتھ یا سر دے کر سیدھی کر دی۔ لیکن موسےٰ علیہ السلام کو ان پر غصہ تھا۔ کہ انہوں نے ہمیں پانی تک نہیں دیا۔ یہ خضر نے کیوں ان سے بھلائی کی۔ تو کہہ دیا۔ کہ تم مزدوری لے سکتے تھے۔ یعنی کچھ لے کر کھانا کھاتے۔ بے مروّتوں سے مروّت کیسی۔

بے صبری پر بے صبری

جب تینوں موقعہ پر حضرت موسےٰؑ اپنے وعدے پر پورے نہ نکلے۔ اور خود ہی فیصلہ بھی دے چکے تھے۔ تو خضر نے فرما دیا۔ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ط سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ

صبر ہو گا کہ تمہارے اور میرے درمیان یہ جدائی ہو چکی ہے لیکن تمہیں حقیقتِ حال سے خبردار کرتا ہوں جس پر تم صبر نہ کر سکے۔

ایک طرف تشریع ہے۔ اور دوسری طرف تکوین۔ ایک صاحب نبوت ہیں۔ اور دوسرے صاحب ولایت۔ ایک کا علم ظاہر سے ہے۔ دوسرے کا علم باطن سے۔ ایک جسم ہے۔ اور دوسرا جان۔ گفتگو آپ پڑھ چکے۔ علم لدنی کے کرشمے دیکھ چکے۔ اور علم ظاہری کی بے صبری ملاحظہ ہو چکی۔ لیکن اس کے باوجود نبی نبی ہے۔ اور ولی ولی۔ رعایا کا کوئی فرد اپنے علم میں دس گنا بھی زیادہ بادشاہ سے ہو۔ تو پھر بھی حکم بادشاہ کا ہو گا۔ اور رعایا کا فرد محکوم۔ نہ اس سے بنوت میں خلل آتا ہے نہ اس سے ولایت کے درجہ کے علم کو کم کرنے کا طریقہ سوچا پڑتا ہے۔ لیکن تکوین کے اندر کس درجہ کا علم ہے۔ اور کس درجہ کا تیقّن اور تشریع جب کبھی یقین حاصل کرتی ہے۔ تو تکوین کے مشاہدات سے۔ اور ذات الٰہیّہ کے ذاتی انعکاس سے۔ صفات خواہ کتنی بلند ہوں۔ پھر صفات ہیں۔ ذات الٰہی کے صفات ذات سے جدا نہیں۔ لیکن پھر بھی ذات تو نہیں ہو سکتے قرآن حکیم میں فرماتے ہیں وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ ایسے ہی ہم نے حضرت ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے اندر حقیقتیں دکھائے۔ تاکہ وہ یقین کرنے والوں سے ہو جاوے۔ تمام انبیا کو پہلے مشاہدات وحی موقعہ بموقعہ دکھائے جاتے ہیں جن سے تیقّن بلند ہوتا جاتا ہے۔ اور ہر نبی کی فضیلت کا درجہ اسی تیقّن توحید پر ہوتا ہے۔ خود قرآن حکیم فرماتا ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ

اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَہُمْ دَرَجٰتٍ ط وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط یہ پیغمبر بزرگی دی ہم نے بعض ان کے کو اوپر بعض کے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں۔ کہ باتیں کی اللہ نے اور بلند کیا بعض ان کے کو درجوں میں اور دی ہم نے عیسٰے بیٹے مریم کو دلیلیں ظاہر۔ اور قوت دی ہم نے اس کو ساتھ جان پاک کے۔ دیکھئے مولٰے کریم موسٰے علیہ السلام سے عیسٰے علیہ السلام کے مدارج بلند دکھانے کے لیئے " وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط" بڑھاکر عیسٰے علیہ السلام کو کتنا بلند فرما دیا۔ کیوں اسی نسبت تکوینی کی وجہ سے۔ اور اسی تیقن کی وجہ سے مولٰے کریم سے پکے پکائے کھانے طلب کرتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے اترتے ہیں۔ کیوں اترتے ہیں۔ صرف ان کے اس تیقن سے کہ وہ ایسے کر سکتا ہے۔ دوسرے انبیا کا اعتقاد بھی تو یہی تھا۔ لیکن اتنی پختگی نہ تھی۔ اور جیسے تیقن حاصل ہو گیا۔ وہ اپنے تیقن کے مطابق اس ذات اقدس سے حاصل کر سکتا ہے۔ حضرت موسٰے کی قوم کے لیئے من وسلوٰی عنایت ہوا۔ لیکن وہ ویسے ہی بے صبر رہے۔ اور مسور مانگنے لگے۔ بے صبری ناشکری ہے۔ یہی وجہ ان کی آوارگی کو بڑھانے والی ہوئی۔ کہ تیقن کم تھا۔ ورنہ حکم پر قریہ میں داخل ہو جاتے۔ تو آوارگی ختم تھی۔

حضرت موسٰے علیہ السلام کا جو درجہ تشریعی ہے۔ اس سے تمام قرآن حکیم بھرا پڑا ہے۔ موقعہ بموقعہ ان کے ذکر سے امت محمدیہ کی ہدایت اور رہبری کے لیئے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ فرعون جیسے سرکش

انسان جو خدائی دعویٰ کئے بیٹھا تھا۔ موسیٰ جیسے نبی کی شان تھی۔ کہ اس کے مقابلہ کے لئے ڈٹ گئے۔ بنی اسرائیل جیسی قوم کو ذلت اور مسکنت سے اٹھا کر عزت و سلطنت پر جا کر بٹھا دیا۔ اور تمام عمر جہاد میں گزار دی۔ ان کا ایک ایک واقعہ دنیا کے لئے ہدایت و رشد کی شمع ہے۔ لیکن دیکھئے آیۂ تفضیل میں کس فصاحت و بلاغت سے عیسیٰ علیہ السلام کا تفضل اور بزرگی و عظمت ظاہر کی گئی۔ اور "وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ"[1] (ہم نے اس کی امداد روح القدس سے کی) کے الفاظ سے کتنا بلند فرما دیا گیا۔ کیوں صرف تکوینی نسبت کی وجہ سے پیدا ہوئے تو تکوینی طریقہ سے بن باپ۔ اٹھائے گئے تو تکوینی ذریعہ سے۔ کہ یہود صلیب پر لٹکا رہے ہیں۔ اور وہ آسمان پر جا پہنچے۔ زندگی میں بھی اسی مناسبت سے اندھوں کو بینا کرتے رہے۔ مردوں کو زندہ کر کے دکھاتے رہے۔ حتیٰ کہ مٹی کے جانوروں میں اپنی روح پھونک کر اسے اڑا دیا۔ لیکن تشریعی نسبت بہت کمزور تھی۔ اس وجہ سے قرآن حکیم میں بہت مختصر ذکر ان کا آیا۔ اور آیا بھی تو وہ بھی یہی کچھ کہ ایسے پیدا ہوئے۔ ایسے اٹھائے گئے۔ ایسے کھانے طلب کئے۔ اور ایسے ہم نے دئے۔ اور ایسے جانور بنائے۔ اور مردے زندے ہو گئے لیکن موسیٰ کی قوم باوجود سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی گوسالہ (بچھڑا) پوجنے لگ گئی۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ط (اس کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور وہ پتھر یا اس سے

---

[1] فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

بھی زیادہ سخت ہو نکلے) کا ارشاد ان کے بارے قرآن حکیم میں موجود ہے۔ بخلاف ان عیسائیوں کے۔ فرماتے ہیں۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ ۔ وہ سنتے ہیں جو اترا ہے رسول کی طرف، تو دیکھتا ہے۔ کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی جگہ عیسوی امت کی نرم دلی[1] کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔ آخر کیوں مشہور ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ موسوی نسبت اپنا رنگ دکھاتی ہے اور عیسوی اپنا اثر دکھائے بغیر کیسے رہ سکتی ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں۔ کہ یہ دونوں نسبتیں آپس میں دست و گریباں بھی رہتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بغیر ان کا زندہ رہنا بھی محال ہے۔

اسلام ان دونوں نسبتوں کو متوازی طریقے سے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اور ذات اقدس صلے اللہ علیہ وسلم مجمع البحرین ہے۔ کسی نسبت کو کسی دوسری پر فوقیت نہیں۔ اور یہی اسلام کی ایک ممتاز صفت دیگر مذاہب سے الگ ہے۔ کہ کسی دوسرے مذہب میں یہ اجتماع ضدین نہیں۔

توحید کی آب حیات ایک ہے قوالب کیوجہ سے رنگ و بو الگ الگ ہے

توحید ایک ایسا سرچشمہ ہے۔ جس نے اس چشمہ سے جتنی سیرابی حاصل کی اسی درجہ سے

---

[1] وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ رَاْفَۃً وَّرَحْمَۃً (پ۲۷ حدید) اور کی ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جو پیروی کرتے تھے اس کی "شفقت اور مہربانی"۔ ۱۲

بقا نصیب ہوا۔ مذاہب کا یہ سرچشمہ ایک ہے۔ لیکن جیسے زمین کا پانی ایک ہے۔ لیکن مختلف الانواع کی زمینوں میں پانی کا ذائقہ پانی کا رنگ و بو الگ الگ ہے۔ اسی طرح توحید ایک ہے۔ لیکن مختلف قوالب کے اندر جب یہ نمودار ہوتی ہے۔ تو قوالب کے اثرات اس کے اندر آجاتے ہیں۔ اور ہر توحید اپنے قالب کے رنگ و بو سے الگ الگ نظر آتی ہے۔ دیکھئے نہیں کہ زمین کا پانی کہیں بہت ہی شیریں اور صاف ہوتا ہے۔ اور کہیں وہی پانی نمکین اور جلاب آور ہو جاتا ہے۔ اور کہیں جاکر وہ مٹی کے تیل میں ڈھل جاتا ہے۔ جسکی بو دماغ کو پھاڑتی ہے۔ ایسے ہی جب قلب عمدہ ہو تو توحید نہایت صاف ستھری صورت میں نمودار ہوتی ہے لیکن جہاں قلب گھٹیا ہو۔ اور اعلے درجہ کا نہ ہو۔ تو اسلام کی توحید بھی وہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اور بعض جگہ تو مٹی کے تیل کی طرح سخت بو دار ہو جاتی ہے لیکن جیسے تیل بے کار نہیں۔ ایسے ہی وہ توحید بھی بے کار نہیں۔ جو معاشرہ انسانی کے قلوب کے لئے آبحیات ہونے کا کام نہیں دیتی۔ بلکہ روشنی اور ایندھن جیسے کام میں آتی ہے۔ ایسے ہی انسانی معاشرہ کے دوسرے معاملات میں روشنی کا کام دیتی ہے مشہور ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ کسی نبی و مرسل کی اصل نسبت معلوم کرنے کے لئے اس کی امت پر نظر کی جاوے۔ اور کسی ولی کی ولایت کے لیے اس کے مریدین کو دیکھا جاوے جو اثر مریدوں پر ہے۔ وہ اصل کی حقیقت ہے۔ موسےٰ علیہ السلام اور عیسےٰ علیہ السلام ایک مشرب توحید رکھتے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے طبعی زمین کے اثرات سے توحیدی آبحیات دونوں کا الگ الگ صاف نظر آرہا ہے۔ اسی وجہ سے

تصوف میں مشرب موسوی اور مشرب عیسوی دونوں کے حقائق الگ الگ دکھائے جاتے ہیں۔ اور نسبت محمدیؐ کو ایک الگ مقام بلند دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ "نسبت بلند" آب زلال کی مثال ہے۔ اس کا پانی لب سے زیادہ شیریں اور خوش ہضم ہے اور رنگ و بوئے بے مثال۔ دیکھنے میں خوبصورت۔ سونگھنے میں خوشبودار۔ اور کھانے میں خوش ذائقہ۔ اور نتائج صحت میں معاشرہ کے اندر بے مثال اسلئے فرمایا گیا۔ ع آخر آمد بود فخر الاولیں

ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس لئے توحید محمدیؐ کا درجہ تمام توحیدی ادیان سے بلند ہے اور ہر توحید اس کے سامنے سرنگوں ہے۔ اور اسی وجہ سے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ تمام بنی نوع کو مخاطب فرما کر کہا گیا۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ جو اس توحید کے اندر داخل ہوا اور اس کے اسرار و غوامض سے واقف ہوا۔ وہ اس یقین پر پہنچ گیا۔ کہ جو کچھ ہے نسبت محمدیؐ ہی محمدی ہے۔ اور باقی اظلال ہیں۔

اب پھر اصل قصہ کی طرف چلیں۔ کہ جس کی نمنتے بے صبری کی وہ تمہیں میں بتلا دوں تاکہ تمہیں اصل رشد کا پتہ چلے۔ جس کی تعلیم کے لئے میری طرف آپ کو بھیجا گیا تھا هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ لیکن مرشد کے لئے یہ بھی تو ضروری تھا۔ کہ اپنے ظاہری نامناسب اعمال کی حقیقت بھی تو کھول دے۔ تاکہ اپنے مرید کا دل تسلی پکڑ جائے۔ کہ واقعی میں حقیقت حال تک نہیں پہنچا اور میری بے صبری بے معنے تھی۔

چنانچہ کہہ دیا گیا۔ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ

عَلَيْهِ صَبْرًا o جس پر تم صبر نہ کر سکے اس کی حقیقت اصلیہ پیش کر دیتا ہوں چنانچہ خضر علیہ السلام نے "تاویل" یعنے حقیقت حال پیش کر دی۔ فرمایا:۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا o یہ کشتی مسکین غریبوں کی تھی۔ جو دریا میں اپنا کاروبار کرتے تھے۔ تو میں نے اسے عیب ناک کر دیا۔ کیونکہ بادشاہ ہر کشتی کو پیچھے بیگار میں پکڑے آتا تھا۔ تاکہ وہ عیب دار ہونے کی وجہ سے اسے نہ پکڑے۔ اور یہ غریب اپنا کاروبار کرتے رہیں۔

اب یہ سوچیئے گا۔ کہ یہ فعل مذموم تھا۔ یا محمود۔ کہ مسکینوں کی کشتی بیگار میں نہ پکڑی جائے

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا o فَاَرَدْنَا اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا o ہاں۔ غلام کے ماں باپ مومن تھے پس ڈر پیدا ہو گیا۔ کہ وہ لڑکا کفر اور سرکشی سے ان کو کہیں ذلیل نہ کر دے۔ تو ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کے لئے اس سے بھلائی ستھرائی اور محبت ولگاؤ والی اولاد بدل دے۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ج فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ج

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ؕ دیوار دو یتیم بچوں کی اس شہر میں تھی۔ اور اس کے تلے ان کے لئے پہلے بنیاد میں مال نقدی رکھا ہؤا تھا۔ اور ان کے ماں باپ بڑے صالح تھے۔ تو تیرے رب نے چاہا۔ کہ وہ جوان ہو کر تیرے رب کے فضل و کرم سے وہ خزینہ پالیں۔ لیکن یہ جو کچھ میں نے کیا اپنے خیال سے نہیں کیا۔ بلکہ رب کے حکم سے۔ یہ بیان ہے۔ ان چیزوں کا جس پر تم صبر نہ کر سکے۔

قرآن حکیم کی بلاغت و فصاحت سے تو کفار کو بھی انکار نہ تھا۔ لیکن کسی مقام پر بھی آیات قرآنی پر غور کیا جاوے۔ تو بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔

ع ہزار نکتۂ باریک تر ز مو این جا است

ان آیات پر ہی غور فرمایا جائے۔ کس فصیحانہ اور بلیغانہ طریقہ سے واقعات اور سوال و جواب کو اپنی معجز بیانی سے ادا فرمایا۔ کچھ ارشادات پیش کئے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے غور فرمایا جاوے۔ کہ منصب دار نبوت حضرت موسےٰ علیہ السلام کے اعتراض اصل حقیقت موسوی کو کیسے اظہار کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا پھر اس پر بھی صبر نہیں فرمایا۔ کھلا کہدیا۔ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا ؕ تم نے کشتی کو اس لئے پھاڑ دیا کہ اس کے سوار غرق ہو جاویں۔ پھر اس پر غصہ کا اظہار فرمایا۔ اور فرمایا کہ تم انوکھی بات کہہ گئے۔ لیکن راز دار ولایت اس کے مقابل جو بیان دیتے ہیں۔ تو کتنے ٹھنڈے دل سے۔ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا ؕ کیوں۔ صرف اس لئے کہ کشتی مسکینوں کی تھی۔ اور اپنی روزی اس کے ذریعہ دریا

ہیں کماتے تھے۔ اور بادشاہ ہر کشتی کو بیگار میں پکڑے آرہا تھا۔ ایسے ہی جب فرمایا۔ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝ تو نے ایک پاک جان کو بلا بدلہ قتل کر دیا۔ تو نے ایک نامعقول چیز کر دی۔ چونکہ پہلا معاملہ کم تھا۔ اس لئے "شَيْئًا اِمْرًا" کہا۔ اب بہت بھاری معاملہ قتل کا کر دیا۔ تو صاف کہدیا "شَيْئًا نُّكْرًا" لیکن راز دار محبت کا جواب سُنیئے۔ غلام (بچے) کو کیوں قتل کیا۔ اس لئے فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝ کہ ہمیں تو اس کے کفر و سرکشی کا خوف تھا۔ کہ کہیں اس کی حیات زندگی سے اس کے ماں باپ ذلیل نہ ہوں۔

یہ دو نو فعل ظاہراً برے تھے۔ اور ناجائز۔ اس پر جھنجلا دیا۔ حضرت موسےٰ کرتے تو بجا تھا۔ لیکن مہمانی نہ ملنے پر ناراض ہونا۔ ایک نیک کام کرنے پر یہ کہہ دینا لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ اگر تم چاہتے تو اجر لے سکتے تھے۔ گو موسےٰ علیہ السلام نبی ہی ہوں۔ دل میں کھٹکتا ہے۔ کم و بیش موسےٰ علیہ السلام کو اس موقعہ پر تو خاموشی اختیار کرنی تھی۔ لیکن صاحب شریعت نبی کو مہمانی نہ ملنے پر رنج ہوا۔ اور جبلی طور پر آپ فرما گئے مگر واہ رے ولایت۔ روٹی کھانے کو اہل دیہہ دیتے نہیں۔ لیکن بھلائی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

پھر موسےٰ ؑ جو کچھ فرماتے ہیں۔ اپنے بشری تقاضا سے فرماتے ہیں۔ لیکن خضر جو کچھ کرتے ہیں۔ اپنے ارادے سے نہیں کرتے۔ بلکہ بغیر جھجک کہدیتے ہیں۔ کہ اے منصب دار شریعت تم گھبرا گئے۔ میں نے تو کوئی کام بھی اپنے ارادے

سے نہیں کیا۔ آپ کیوں معترض ہوئے۔ اگر موسےٰ علیہ السلام بھی ذرا سی توجہ
فرما لیتے۔ تو غالباً یہ عقدہ پیدا نہ ہوتا۔ یعنے مولےٰ کریم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا
لیتے۔ لیکن مولا کریم کو سبق دلانے منظور تھے۔ کہ موسےٰ! گو تم اپنی جگہ منصب دارِ
نبوت ہو۔ لیکن ایک راز دار ولایت کے ساتھ بھی اس معاملہ میں مقابلہ نہیں
کر سکتے۔ تمہارا منصب اور۔ اس کی رازداری یا علم اور۔ دنیا میں حکم آپ کا۔
اور آپ امت کے مالک۔ لیکن باطن کا معاملہ کچھ اور ہے۔ کچھ ایسے بندے
بھی میری چادرِ کبریائی میں ہیں۔ جو کوئی ایک امر بھی میری خواہش و ارادہ کے
بغیر نہیں کرتے۔ اور ہر کام میرے ارادے کے ماتحت کرتے ہیں۔

آئیے اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے۔ اور خطوط کشیدہ افعال کا
مطالعہ فرمائیے۔ پہلے واقعہ کے جواب میں "فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا"
میں ارادت کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی۔ دوسرے واقعہ قتل میں اپنی
ذات کے ساتھ ایک اور کو بھی شامل فرماتے ہیں۔ فَخَشِيْنَا اور فَاَرَدْنَا
فرما کر ذاتِ اقدس کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ تیسرے واقعہ میں جہاں موسےٰ کو
ایک نیک کام پر بھی اعتراض ہے۔ فعل کی نسبت صرف ذاتِ خداوندی
کی طرف فرما کر ان کی توجہ پر ایک کاری ضرب لگاتے ہیں اور فرماتے ہیں
فَاَرَادَ رَبُّكَ۔ اور پھر رَبِّیْ بھی لفظ نہیں فرمایا۔ بلکہ رب کی نسبت ان
کی ذات کی طرف پھیر دی۔ تاکہ ان کے دل پر زیادہ موثر ثابت ہو۔ کہ کتنی
بے صبری ہوئی۔ جب خود میرا رب یہ ہی چاہے۔ تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے
لیکن اَرَدْتُّ۔ اَرَدْنَا۔ اَرَادَ۔ ایک نہیں۔ بلکہ ہر واقعہ میں الگ

نسبتوں سے فاعلیت کو ایک کر دیا۔ اور کھلا واضح فرما دیا۔ کہ اللہ کا بندہ خود کچھ نہیں ہوتا۔ اگر فعل کو اپنی طرف منسوب کرے تو۔ اور اگر اپنے آپ کو مولئے کریم کے ساتھ شریک کرے تو۔ اور اگر اپنے فعل کو اٹھا کر صرف ذات اقدس کی طرف نسبت کر دے تو۔ نہ شرک ہے۔ نہ کفر۔ بلکہ عین اظہار عبودیت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اخیر میں تمام فعلی نسبتوں پر ایک ایسی مہر لگائی جس میں کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ فرمادیا وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ ۔ اب غور کیا جاوے۔ تو نہ کشتی میں وہ فاعل حقیقی تھے۔ نہ قتل میں۔ بلکہ حکم کے تابع ایک بندۂ مومن تھا۔ جو ہر حکم کی تعمیل کے لئے بلا چون و چرا نبار ہے۔ لیکن اس کے سامنے تمام افعال کے مقاصد و اغراض کو بھی پہلے ہی سامنے کر دیا گیا۔ تاکہ اسے تردد نہ ہو۔

اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ اس حقیقت ولایت کے سامنے نہ رکھنے سے بعض اہل علم اعتراض در اعتراض کرتے جاتے ہیں۔ اور کسی ایسے فعل کو جسکی نسبت فاعل حقیقت رہی ہے اپنی طرف منسوب کرنے سے شرک سے تعبیر فرماتے ہیں۔ لیکن اگر قرآن حکیم کے ایسے مواقع کو مطالعہ فرمایا جائے۔ تو یہ اعتراض اور یہ شرک کا واہمہ تمام خود بخود دور ہو جاتا ہے۔

فَاَرَدْنَا اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ہ کا جملہ صاف بتلاتا ہے۔ کہ اللہ کے بندے بعض تقدیروں کو پلٹ دیتے ہیں۔ اور پلٹ سکتے ہیں۔ کتنے صاف الفاظ ہیں کہتے ہیں۔ ہم نے ارادہ کر لیا۔ کہ ان کا رب اللہ سے اچھے حال اور بہتری کو تبدیل فرما دیں۔ اقبال رح کا کہنا

درست ہے۔ ۶

نگاہِ مردِ مومن سے پلٹ جاتی ہیں تقدیریں

کیا قرآن حکیم سے ہی یہ نتیجہ پیدا نہیں کیا گیا۔ اور پھر جسے اس راہ میں کچھ بھی تعلق ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ اللہ اپنے بندے کی کیسے سُنتا ہے۔ اور کیسے قبولیت دیتا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ بھی یہ خبر دیتا ہے لیکن یہاں ارادہ ازلی ارادہ بندے کے ساتھ ایک ہو رہا ہے۔ اِس لئے اَرَدْنَآ کہدیا۔ ورنہ یہاں جمع متکلم کی جگہ صرف اپنا آپ ہی پیش کرنا ہے۔

غرض۔ دونوں میں سے ایک بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی۔ کہ یا تو یہی بات ہے۔ کہ ارادہ ازلی۔ ارادۂ بندۂ مومن کے ساتھ چلتا ہے۔ یا یہ کہ خود ذات اقدس بندے کے اندر بول رہی ہے۔ جیسے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ جمع کی صورت میں زبان محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے ادا فرمایا گیا لیکن اولیٰ یہی ہے کہ پہلے "اَرَدْنَا" میں حضرت خضر کو شامل کیا جاوے۔ کیونکہ دوسری بار پھر فرماتے ہیں۔ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا۔ کہ پہلی اپنی ارادت پھر دوسری تبدیلی رب سے چاہتے ہیں۔

مجاذیب الٰہی کو اکثر دیکھا۔ کہ متکلم بصورت جمع بات کرتے ہیں۔ اور اس میں ذات خود کا تصور نہیں کرتے۔ بلکہ جب نسبت ذاتی سے کوئی بات کرنی ہوتی ہے تو اپنے نام کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً۔ بندی[1] ایسے کرتا ہے۔ ایسے کہتا ہے۔ لیکن عام گفتگو کا انداز گفتگو جمع متکلم ہوتا ہے۔ جس کے اندر اپنے آپ کو شامل نہیں کرتے۔ مثال کے

---

[1] سائیں بُندی ایک مجذوب صاحب باطن فقیر تھے۔

طور پہ میں اپنا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

جب میں ملازم تھا۔ اور میرے والد قبلہ رحمۃ اللہ علیہ وفات پا گئے۔ تو بعض معتقدین محبت سے مجھے مجبور کرتے تھے۔ کہ ملازمت ترک کر کے گھر کا کام کاج اپنے باپ دادا کا سنبھال لوں۔ یعنی خانقاہیت کی بوریا نشینی اختیار کر دوں لیکن میرے اندر اخباری دنیا بستی تھی۔ مجھے خانقاہت کے ٹکڑے پسند نہ تھے۔ جیسے عام ذہنیت ہوتی ہے۔ کہ یہ مفت کھاتے ہیں۔

اس زمانے چند مجذوب بزرگوں کی شہرت تھی۔ ایک سائیں گوراں دِتا تھے۔ جو تحصیل پھالیہ کے ایک گاؤں ٹھٹہ عالیہ میں رہا کرتے تھے۔ ویسے تو نام کے ہندو تھے۔ لیکن ہندوؤں سے بڑھ کر مسلمان زائرین ان کے پاس جاتے تھے۔ میرے ایک دوست کا گذر بھی وہاں پر اکثر ہوتا تھا۔ اور اکثر ان کے پاس جاتے تھے۔ اور کچھ نہ کچھ ان کی باتیں سُن کر آتے تھے۔ اکثر ان کا ذکر میرے پاس بھی ہوتا تھا۔ مجھے بھی ایام رخصت میں وہاں سے گذرنا تھا۔ میں بھی ان کی خدمت میں چلا گیا۔ اور بیٹھ گیا لیکن خیال وہی تھا۔ کہ خانقاہت کا ٹکڑا ذلیل ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔ گوراں دتہ! کچھ تو نے دیا کچھ میں نے دیا۔ مل کر روٹی پک گئی۔ کچھ تو نے کھائی کچھ گوراں دتہ نے تو پھر ایسے ویسے کا گوراں دتہ پر کیا احسان۔ اس نے اپنا کھایا گوراں دتہ نے اپنا کھایا۔

اس کے بعد یہ خیال بھی تھا کہ میری کیا قیمت ہے۔ جب میرے بزرگ اور میرے چچا موجود ہیں۔ اور خاصکر برادر مکرم مولانا فخرالدین صاحب جو حضرت میرے دی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے بعد ایک اچھے صوفی صافی ہو چکے ہیں۔ اور عبادت و ذکر فکر میں یکساں درجہ بلند رکھتے ہیں۔ اور میں ہوں پُر از خطا۔ نہ دین سے مس۔ نہ ذکر و فکر سے تعلق۔ تو اس کے جواب میں

سائیں صاحب نے کہدیا۔ کہ جڑ پھوٹتی ہے۔ شاخیں نہیں پھوٹتیں۔ اس پردونوں باتوں کا حل میرے سامنے آگیا لیکن دنیادار کب مانتا تھا۔ کہ کرسی چھوڑ کر چٹائی پر بیٹھ جاؤں۔ اور لکھی پڑھی دنیا سے الگ ہو کر جاہل دنیا میں بسیرا اختیار کر لوں۔

لیکن قدرت خدا مولائے کریم مجھے آہستہ آہستہ خود بخود جذب فرماتے گئے۔ اور ملازمت کے بدلنے کے لئے پشاور چھوڑ دیا۔ اور گھر آکر بیٹھ گیا۔ کہ آج جاتا ہوں۔ کل جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ اسی کوزہ و مصلّے کا ہو رہا۔ جس سے نفرت تھی۔ اور وہی کچھ سامنے آرہا جو سائیں گوراندتہ نے کہا تھا۔ اور وہ بات بھی نکل گئی۔ کہ ہم کسی کا کھاتے ہیں۔ گو کھاتے لوگوں کا ہیں لیکن خیال یہی ہے۔ کہ ہم کھلاتے ہیں لنگر کسی کے باپ کا نہیں۔ خدائے قدوس کے فضل و کرم کا دستر خوان ہے۔ خود کھاتے اوروں کو کھلاتے ہیں

غرض بہت سے ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اکثر یہی دیکھا۔ کہ جب یہ لوگ کلام جمع بولتے ہیں تو منشاء الٰہی سے بول رہے ہوتے ہیں اور جب ذاتی بات آجائے تو اپنے نام کی نسبت دیگر بولتے ہیں۔ اگر خضر بھی ایسی نسبت سے "اَرَدْنَا" بول گئے ہوں۔ تو کیا عجب۔ منصبدار نبوت کے امیدوار کو اپنی قوم کے بندے نے دُہائی دی۔ جبکہ دوسری قوم کا آدمی اس پر غالب ہو رہا تھا۔ ان کو قومیت کے جوش نے ابھارا۔ اور ایک ایسا مکّہ مارا کہ وہ وہیں مرگیا۔ اس کا مرنا تھا کہ بے اختیار عاجزی اور حضوری میں فرمانے لگے هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ○ کہ یہ شیطانی کام ہو چکا۔ کیونکہ وہ ایک دشمنِ انسان اور گمراہ کنندہ ظاہر ہے۔ اور ساتھ ہی بارگاہ غفور الرحیم سے اپنے گناہ کی معافی کے لئے عرض کیا۔ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ۔ اس استغفار سے مولیٰ کریم نے معافی فرمائی۔ اور فَغَفَرَ لَهٗ ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ اس نے بخشش فرمادی کیونکہ وہ بخشنہار رحیم ہے۔ اے اللہ جو انعام مجھ پر فرمائے اس کی وجہ سے میں کبھی کسی مجرم کا مددگار نہ بنوں گا۔

لیکن راز دار قدس کو دیکھئے۔ کہ وہ ایک نوجوان کو قتل کرتا ہے۔ جس کا کوئی قصور نہ سامنے نہیں۔ اور کوئی وجہ اسکے قتل بلکہ دھمکانے کی بھی نہیں آتی۔ تو ایسے بے گناہ کو

بکرے کی طرح ذبح کر دیتے ہیں۔ ذرا سی پریشانی نہیں آتی۔ کہ میں نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا۔ بلکہ جب موسٰے علیہ السلام نے کہا بھی۔ کہ ایک پاک جان کو بلا قصاص تم نے مار دیا۔ اور تونے بڑی نامعقول بات کر دی۔ تو اس کے بجائے کہ ان کو ندامت ہوتی پریشانی ہوتی۔ الٹا کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں نہ کہا تھا کہ تم میرے کاموں پر صبر نہیں کر سکتے۔ اور برابر خاموش چلے جاتے ہیں۔ نہ لوگوں کا ڈر نہ اس کے ماں باپ کا خوف نہ ادھر بھاگتے ہیں نہ ادھر۔ نہ کوئی پوچھنے والا۔ بخلاف حضرت موسٰیؑ کے کہ خوف کھاتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی بھاگا آتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے۔ کہ تجھے قتل کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں۔ تو بھاگ جا۔ تو موسٰےؑ بھاگتے ہیں۔ اور ساتھ دُعا کرتے جاتے ہیں۔ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (یا اللہ مجھے ظالموں سے خلاصی دے)

لیکن یہاں بھاگنا نہیں۔ بلکہ حسب معمول اپنے کام میں وہ چلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ قصہ دیوار پیش آتا ہے اور اپنے کام کر چکنے کے بعد نہایت بے باکی کے ساتھ اپنی کارگذاری ایک مصلحت عامہ و خاصہ الٰہی سے پیش کرتے ہیں۔ اور صاف کہہ دیتے ہیں۔ کہ جن کاموں کو تونے بُرا سمجھا وہ اصل میں بڑے چھوٹے محمود تھے۔ اور پھر میں نے اپنے ارادے تو کئے ہی نہیں۔ بلکہ ارادۂ ازلی کے ماتحت جو کچھ کیا، کیا۔ کاش آپ سمجھتے۔

کشتیوں کی بیگار۔ بچہ نوجوان کا قتل ہونا۔ اور دیوار کے نیچے خزانے کے ہونے کا پتہ کیسے راز دار قدس کو معلوم ہوا۔ نہ تو وحی کا سامان ہے۔ نہ کشف کی صورت ہے نہ قیافہ ہے۔ آخر یہ کیا ہے۔ یہ وہی "علم لدُنی" جس کی تعلیم کے لئے موسٰی علیہ السلام کو چند سبق دلانے منظور تھے۔

اسے غیب دانی کہا جائے تو کیا بُرائی۔ بلکہ میں تو کہوں گا۔ غیب دانی کا کہنا بھی اس موقعہ پر معیوب ہے۔ اسے علم لدنی سے ہی تعبیر کیا جائے تو ٹھیک ہے۔ ارادۂ ازلی جب کسی کے سامنے ہو۔ تو اسکے لئے کیسے الفاظ تعبیر کئے جاویں۔ آج یہ بحث عام ہے۔ کہ غیب سے کسی کو کچھ حصہ ملا ہے یا نہیں بعض کلیتہً منکر ہیں بعض کلیتہً قائل بطف یہ ہے کہ علمائے کرام غیب کی کچھ ایسی تعریف کرتے ہیں۔ کہ تمام ایسی پوشیدہ باتیں جو کسی کے مشاہدہ میں نہ آتی ہوں۔

اور وہ کوئی بتا دے۔ تو اس کو غیب نہیں گردانتے۔ بلکہ کشف وکرامت الفاظ وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن طبقۂ عام ہر اس چیز کو جو آنکھوں کے سامنے نہ ہو اس کو غیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ہر غیر مشاہدہ کے بیان کرنے والے کو غیب دان کہہ دیتے ہیں۔ ورنہ جیسے آیات سے دیکھا گیا ہے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کہ تمام افعال کی علّت کسی کے سامنے نہ تھی خود حضرت موسٰیؑ جیسے اولوالعزم ان سے بے خبر تھے۔ تو ایسے اشیا کے ظاہر کرنے سے خضری علم کو کس سے تعبیر کیا جاوے۔ آخر یہی غیب سے تعبیر کریں گے۔ اور حقیقتاً ہے بھی غیب جو آپ نے بتا کر موسٰیؑ علیہ السلام جیسی پاک ہستی کو اپنے سامنے گردن جھکانے پر مجبور کر دیا۔ بہر صورت اصطلاحات کی وجہ سے جھگڑا ہے۔

میری تحریر سے کسی کو یہ شبہ پیدا نہ ہو جاوے۔ کہ حضرت خضر حضرت موسٰی علیہ السلام سے قرب خداوندی میں بہت بلند مدارج رکھتے تھے۔ اور حضرت موسٰی علیہ السلام باوجود ایک نبی ہونے کے اس درجہ پر نہ پہنچے جس درجہ پر حضرت خضر تھے۔

بے شک تقرب کی وجہ سے حضرت خضر کو جو علوم نصیب ہوئے۔ وہ حضرت موسٰیؑ کو نصیب نہ ہوئے۔ کیونکہ صاحب تقرب کو تقرب کی وجہ سے ایک گونہ تمام معاملات اور رازہائے سربستہ سے انعکاسی صورت دل کے اندر پیدا ہو جاتی ہے لیکن منصبدار خلافت سے اسے کیا نسبت۔ یہ پوری امت کا مالک ہوتا ہے۔ اور اپنی امت کا سربراہ۔ اس کے تمام احکام واجب التعمیل۔ اور اس کی شریعت حقہ پر ایمان لانا ہر ایک امتی کا فرض۔ اس کی دعوتِ عامہ کو جو ٹھکرائے۔ وہ کافر کہلاتا ہے۔ بخلاف رازدارِ الفت کے۔ کہ وہ دعوت عمومی چھوڑ خصوصی دعوت کا بھی مالک نہیں۔ وہ جانتا ہے لیکن حکم کے سوا ایک قدم اٹھا نہیں سکتا۔ اور وہ ایک امتی کی طرح اپنے آپ کو اپنے رسول کا ایک امتی خیال کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس کا مقلد عمومی خیال کرتا ہے۔ وہ اسے نائب خدا سمجھتا ہوا۔ اس کی شریعت کا علمدار ہوتا ہے اس کی توضیحی مثال ایسی ہے۔ جیسے گورنر جنرل کا سکتر خصوصی۔ جسے پرائیویٹ سیکرٹری یا پرسنل اسسٹنٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ وہ گورنر جنرل سے جو تعلق حاضری رکھتا ہے۔ اور واقفیتِ خاصہ۔ اس کی

برابری گورنر صوبہ نہیں رکھتا لیکن منصب اور عزت اقتدار کے لحاظ سے گورنر ایک صوبہ کا واحد قہار مالک ہوتا ہے۔ بخلاف سکرٹری کے کہ اسے کوئی حق اس قسم کا نہیں ہوتا اُسے گورنر جنرل کی منشی گیری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک دوست گورنر جنرل کی دوستی کی وجہ سے علاقہ کے تمام رازہائے سربستہ سے واقف بھی ہو جائے۔ اور بعض واقفیت میں گورنروں سے بڑھا بھی ہو لیکن مملکت سے اسے کچھ اقتدار نہیں۔ اور نہ ہی کوئی اس کے سوا جانتا ہے۔ کہ اسے دوستی کی نسبت اس سے ہے۔ اور اس نسبت سے وہ کچھ کرا سکتا ہے۔ جو دوسرے بعض منصب دار حکومت نہیں کرا سکتے لیکن منصب دار خلافت خلیفۂ الٰہی ہوتا ہے۔ اور تمام امت کا سربراہ ہوتا ہے۔ اور وہ صرف اپنی ذات واحد سے تعلق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر سب اپنی مرضی سے بھی کرالے۔ پھر بھی حکم گورنر جنرل کا ہوگا۔ تو اسے باطن سے تعلق محدود نصیب رہے گا۔

اس لئے کسی صورت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت خضر کو فوقیت نہیں۔ ہاں۔ وہ تقریب جو ایک درِ دولت پر حاضر رہنے والے کو نصیب ہوتا ہے وہ ایک گورنر کو نصیب نہیں ہوتا۔ خواہ کتنے ہی اقتدار اور نیابت کا مالک کیوں ہی نہ ہو۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے اپنے مکتوبات میں اس حقیقت کو خاص واضح فرمایا۔ صاحبِ فکر اس کو مطالعہ فرمالیویں۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ

نوٹ:- ہر صفحہ کے عنوانات کے ذریعے زیرِ عنوان عبادت کی توضیح مطلوب ہے۔ عنوانات کی تجدید سے مضمون کے تسلسل میں کوئی فرق ذہن میں نہیں آنا چاہیئے۔

شریعت اور طریقت کا فرق

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ - آیاتِ قرآنی پر نظر دوبارہ سہ بارہ ڈالیئے۔ کیا یہ صاف روشن نہیں ہو گیا۔ کہ شریعت اور ہے۔ اور طریقت[1] اور۔ شریعت کو اگر ظاہری علل و اسباب کے ساتھ تعلق ہے۔ تو طریقت کو باطنی سر رشتہ کے ساتھ وابستگی ہے۔ ایک کا تعلق عالمِ خلق کے ساتھ ہے۔ اور دوسرے کا جوڑ عالمِ امر کے ساتھ۔

طریقت بلند استعداد لوگوں کے لئے ہے

بے شک شریعت اوّل ہے۔ اور طریقت بعد۔ یہ بھی نہیں کہ شریعت کی طرح طریقت کی راہ پر ہر انسان کے لئے چلنا ضروری ہو۔ یہ استعدادی معاملہ ہے۔ جن کی استعداد شریعت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اُن کے لئے جادۂ طریقت میں قدم رکھنا ضروری نہیں بلکہ یہ اپنے اختیار کی بات نہیں۔ جیسے شریعت اپنے اختیار سے تعلق رکھتی ہے۔

[1] اس علیحدگی میں تخالف نہیں

طریقت کے لئے عفّت ضروری ہے

یہ صرف موہبتِ عُظمیٰ ہے۔ جو نیک سرشت انسانوں میں سے کسی کے حصّہ میں آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ حلال وحرام کی تمیز رکھنے والوں کے لئے ہی یہ دولت ہے۔ گنہگار انسانوں کے لئے یہ دروازہ نہیں کُھلتا۔ اور ہرگز نہیں کُھلتا۔

طریقت باطنی مشاہدے کا دوام ہے

طریقت کیا ہے؟ وہی جسے علمِ لدُنی سے تعبیر فرمایا گیا۔ اور جو ظاہر سے نکل کر باطن میں قدم رکھتی ہو۔ جس کا تزکیہ صرف ظاہری نہ ہو بلکہ باطنی ہو جو ہر چیز کا سر رشتہ اپنے مشاہدہ سے خدائے ذوالجلال سے جُڑا ہوا دیکھے۔ جس کے ہر خیال میں خدائے قُدّوس کے روشن انوار نظر آویں۔

صاحبِ طریقت کو کیسا ہونا چاہیئے

اس کی کوئی گھڑی بھی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی کے مطابق اِدھر اُدھر نہ پھرے۔ ایک ہو اور صرف ایک۔ تمام جہان اس کے لئے ایک واہمہ سے بڑھ کر حقیقت نہ رکھتا ہو۔ اور دنیا کی ہر حقیقت کو حقیقت جانتا ہو اور رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا وِرد زبانِ حال سے چلتا ہو۔ اور اپنے پرائے سے نگاہ اُٹھ جائے۔ "خیر محض" دنیا کو سمجھے اور دنیا کے تمام امور کیا سفلی کیا عُلوی۔ تمام کی حقیقت ایک جانے۔ اور قدرتِ الٰہی کا کرشمہ۔

چوں وچرا کی گنجائش اپنے دل میں نہ پائے۔

صاحبِ شریعت کے تأثرات

موسیٰ علیہ السلام شریعت کے منصبدار۔ اور توراۃ جیسی مقدس کتاب کے مالک۔ اور ایک امت کے مقتدا ہونے کے باوجود اکثر خدائی کاموں پر اپنے بشری اور فطری تقاضے سے معترض ہو جاتے تھے۔ اور صرف اعتراض نہ ہوتا بلکہ اعتراض سے بڑھ کر بارگاہِ الٰہیہ میں بے ادبی بھی کر بیٹھتے تھے۔ یہاں تک کہ گناہوں کی معافی کے لئے جب ستر آدمیوں کو پیش کیا گیا۔ اور بجلی ان کو کھا گئی۔ تو کھلے الفاظ سے مخاطب ہوئے۔ اَتُھلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَآءُ مِنَّا۔ کیا بے دنوفوں کے افعال پر ہمیں ہلاک کرنا ہے؟ اِنْ ھِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ یہ بھی تیری ہی آزمائش ہے۔ ایسے ایک بار نہیں۔ بلکہ کئی مواقع پیش آئے۔ جس پر آپ ایسے بے باکانہ کلمے بے اختیار منہ سے نکالتے رہے۔ چونکہ مولیٰ کریم دلوں سے واقف تھے۔ اور اخلاصِ موسوی کو دیکھتے تھے۔ اس لئے ان کی اس بے ادبی پر ناراضگی نہ فرمائی۔ بلکہ ان کو ایک اور قدم بڑھانے کے لئے خضرؑ کی خدمت میں بھیج دیا۔ خود بھی تعلیم فرما سکتے تھے۔ لیکن ایک غیر کے مشاہدے اور علم سے جو بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بلا تکلف اور بلا تردد حاصل ہونے سے نہیں ہوتی۔

شریعتِ حقہ کی حفاظت کا سامان

صاحبِ علم صاحبِ تقویٰ اب بھی بعض امورِ تکوینی پہ معترض ہوں۔ تو ان کا حق تھا۔

کیونکہ ان کی آنکھیں اس معرفت تک نہیں پہنچی ہوتیں۔ جو انہیں اس اعتراض سے بچائے اور تمام[1] کارخانہ الٰہیہ کو حق جانے۔ یہ بھی ایک فضل ہے۔ ورنہ شریعت کا کون پاسبان ہوتا۔ یہ دولتِ پاسبانی انہیں علمائے شریعت سے ہو رہی ہے کہ ہر ایک امرِ شریعت پر سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔

علمائے حقّہ موسوی مشرب ہیں

یہ لوگ موسوی مشرب زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مولیٰ کریم نے جب ان سے یہی کام لینا منظور کیا ہے۔ تو کیوں اُن کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا جاوے اور کیوں ان کو نرم گفتار اور نرم مزاج بنا کر شریعتِ الٰہیہ کی تذلیل کرائی جاوے۔ جیسا پہلے لکھا گیا ہے۔ طریقت کے لئے قلیل تعداد مستعد نفوس کی ضرورت ہے۔ اور شریعتِ غرّا کے لئے زیادہ (تعداد میں) پاک نفوس کی ضرورت ہے۔ یعنی عوام ان کو دعوت ہے۔ یہ معاملہ ظاہری ہے۔ اس ظاہر کے لئے بہت تگ و دو کی ضرورت ہے۔ اور وہ معاملہ باطنی وہ کبھی کبھی دنیا میں پیش آتا ہے جس کی رہبری کیلئے کسی صاحبِ علمِ لدُنّی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اہلِ طریقت بھی اکثر اہلِ شریعت ہیں

موجودہ وقت میں جو عام طور پر طریقت کی طرف عوام و خواص دوڑتے ہیں وہ اصل میں طریقت کی طرف متوجہ ہو کر نہیں دوڑتے۔ بلکہ وہ شریعتِ الٰہیہ کے تخمینہ

---

[1] رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ الٰہی تو نے جو کچھ پیدا کیا ہے حق پیدا کیا۔

کرنے اور اس پر عمل میں راسخ ہونے کے لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ علمائے شریعت نے اپنے لئے صرف حدودِ الٰہیہ کی نگہبانی تک اپنا نظریہ محدود کر لیا ہے! اور شریعت پر چلنے اور چلانے کے لئے تزکیہ نفس کو جو اصل راس المال شریعت تھا چھوڑ دیا گیا۔ وہ خیال فرماتے ہیں۔ کہ شریعت پہلے ہے۔ اور تزکیہ بعد۔

تزکیۂ نفس مقدّم ہے

لیکن جہاں تک قرآن حکیم کا نظریہ ہے۔ وہاں پہلے تزکیہ بعدہٗ علم شریعت ہے۔ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران آیت ۱۶۴ اور سورہ جمعہ آیت ۲) رسول اُن پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے۔ اُن کا تزکیہ نفس فرماتا ہے (یعنی اُن کو سنوارتا ہے) اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

تزکیۂ نفس کی طرف سے بے توجہی

لیکن ہمارے ہاں معاملہ الٹ گیا ہے۔ کتاب (کلام اللہ) و حکمت (یعنی حدیث) میں تو زندگیاں ختم کر دی جاتی ہیں۔ اور اس کے حصول کے لئے ملک کی مسافتیں طے کی جاتی ہیں۔ اور تزکیہ نفس کے لئے کوشش کرنا تو کجا خود تزکیۂ نفس (یعنی سنورنے) کو ایک بے فائدہ چیز خیال کیا جاتا ہے اور تزکیہ کے لئے قدم اُٹھانا ناجائز سمجھا جاتا ہے

نجات کا مدار تزکیہ پر ہے

حالانکہ دار و مدارِ فلاح تزکیہ پر ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (والشمس) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی (اعلیٰ) فلاح علم پر موقوف نہیں بلکہ تزکیہ پر ہے۔
ایسی صورت میں شریعتِ الٰہیہ کے احکام کی تابعداری اور اطاعت کے لئے جب سامان مہیا نہ ہو۔ تو لامحالہ اس پاک جذبہ کے حاصل کرنے کے لئے صاحب تزکیہ یعنی صاحبِ طریقت کی طرف جانا فطرتاً پیدا ہو جاتا ہے۔

تزکیۂ نفس صاحبِ تزکیہ کا فن ہے

اور چونکہ صاحبِ طریقت اس دولتِ تزکیہ سے مالامال ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایک نگہ سے ہی یہ دولت دلوں کے اندر جما دیتا ہے۔ درحقیقت یہ خدمت علمائے شریعت کے لئے ہموار راہ کی مثال پر ہے لیکن علمائے کرام ان کو اپنا مقابل خیال کرتے ہوئے ان کو گرانے کی فکر میں رہتے ہیں اور ان کے ہر عمل پر بلا تردد کفر و شرک کی آگ برسا کر ختم کرنا چاہتے ہیں ؎

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ یہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

ورنہ معاملہ سہل ہے نظر اپنی اپنی۔ اور کام اپنا اپنا کسی کے بیر سے کیا واسطہ۔

۱؎ ترجمہ: تحقیق نجات پا گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا اور نقصان میں رہا جس نے نفس کو گندا کیا۔

۲؎ ترجمہ: تحقیق نجات پا گیا جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔

۳؎ شریعت کی تابعداری بھی تزکیۂ نفس کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے صاحبِ عقلِ سلیم کو بجا تزکیہ نفس کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

پارہ اوّل میں تزکیۂ نفس کو مؤخر کیوں رکھا گیا

کسی کے ذہن میں یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ پارہ اول (آیتہ ۱۲۶) میں یہ الفاظ قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۔ یہاں تزکیہ بعد ہے اور تعلیم کتاب و حکمت اوّل ہے۔ تو جاننا چاہیئے۔ یہ الفاظ حضرت ابراہیمؑ کی دعا[1] کے ہیں۔ خود ذاتِ قدوس جل جلالہ کے یہ نہیں اور يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ اور وہ الفاظ هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ خود ذاتِ قدّوس جل جلالہ کے ہیں۔

پیغمبر کی تربیت میں تزکیہ کا درجہ اوّل ہے

اس لئے تربیت میں صحیح تعلیم رسالت ایسی ہی تھی۔ کہ آیاتِ الٰہیہ کے پڑھنے کے ساتھ تزکیہ کی طرف کامل توجہ رہتی تھی۔ اور اس کے بعد کتاب و حکمت کی تعلیم کا درجہ تھا۔

نفسانی امراض کا علاج تزکیہ کے سوا کیا ہو سکتا ہے

ایسی صورت میں علمائے ظاہران لاعلاج امراضِ قلبیہ کے دور کرنے کے لئے اپنے اندر کوئی ٹھکانا نہیں رکھنے درشانی دوا تجویز نہیں فرما سکتے۔ تکبر۔ حسد۔ ریا۔ مکر اور نفاق

---

[1] ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتک الاٰیۃ

کا کیا علاج احکام سے ہو سکتا ہے ۔ یہ اندرونی امراض احکام کی زد سے باہر ہیں ۔ قتل و زنا کے لیئے قصاص اور حد شرع ہے ۔ لیکن تکبر و حسد کے لیئے کیا حکم دیا جاوے ۔ اس کا علاج وہی شافی ہے ۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کا فرمایا اور وہ تھی آپ کی نظر مبارک ۔ ہے

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

تزکیۂ نفس اسلام کے اجزائے ضروریہ سے ہے

اسلام خود حکمت و کتاب اور تزکیہ کے متوازی معجون مرکب سے تیار ہے ۔ کوئی ایک جزو الگ ہو جانے سے اسلام اپنی صحیح اسلامی صورت میں نہیں رہتا ۔ ایسے ہی قرآن حکیم بھی ایک بے مثل تریاق یا آبِ حیات ہے جس کے اندر تینوں اجزا برابر اکٹھے ہر آیت میں ملتے ہیں ۔

طریقت خدمتِ خلق ہے

سعدیؒ نے بھی طریقت کی حقیقت اپنے الفاظ و خیال میں بیان کی ہے ۔

ہے طریقت بجز خدمتِ خلق نیست ۔ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

یعنی (خلق خدا کی خدمت کے سوا طریقت کچھ اور نہیں ۔ یہ تسبیح و مصلّٰے اور گودڑی سے نہیں ملتی) حقیقت جذبۂ خدمت تھا جو لاکھوں انسانوں کی معرفت کا باعث ہوا ۔ کہیں تو ایک کتّے کو پانی پلانے سے ہی حجابات اندرونی اور بیرونی

اُٹھ گئے۔ (غرض استعدادی معاملہ ہے) اور کہیں سالوں مجاہدہ کے بعد ایک پردہ بھی نہیں اُٹھا۔

رُشد وارشاد سے بڑھ کر کونسی خدمتِ خلق ہے

ہاں عام جذبۂ خدمت سے بزرگانِ طریقت معمور ہوتے ہیں۔ اور رُشد وارشاد خود کیا ہے؟ یہی خدمتِ خلق اِس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ کہ خلقِ خدا کو غلط راستے سے صحیح راستے پر گامزن کر کے اس کو اندھیرے گھپ سے نکال کر نورِ الٰہی کی طرف پھیر دیا جائے

ذکرِ الٰہی ہی سالک کا راس المال ہے

لیکن قرآن حکیم اور بزرگانِ سلف رحمہم اللہ علیہم اجمعین نے اس راہِ طریقت کے حصول کے لئے اور معرفتِ الٰہیہ کے لئے ذکر و فکر کو بڑا درجہ دیا ہے۔ قرآن حکیم میں جتنا زور ذکرِ الٰہی پر ہے۔ شاید کسی دوسرے عمل پر اتنا نہ ہوگا۔ کیونکہ مسلمان کا راس المال افضل الذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے اور اسی پر دار و مدارِ ایمان ہے۔ سر دست ہم چند آیات پیش کرتے ہیں۔

پارہ ۲۲ سورہ احزاب آیات ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ -

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا هُوَ الَّذِيْ

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کو بہت یاد اور پاکی بولو صبح و شام وہی ہے جو

يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ رحمتیں بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ کہ نکالے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں۔
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝ اور ایمان والوں پر مہربان ہے۔

ذکر کثیر سے دل منور ہوتا ہے

ذکرِ کثیر یعنی بہت ذکر کرنے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی تسبیح و تہلیل پڑھنے کا۔ اس لئے کہ مولیٰ کریم اور اس کے فرشتے ہر وقت تم پر اپنی طرف سے رحمتیں

ل بعض علم دوست حضرات اس ذکر سے کوئی دوسرا ذکر (صرف نماز) مراد لیتے ہیں اور اللہ اللہ کرنے کو ایک فعل عبث قرآن پاک کے برخلاف جانتے ہیں۔ خود دھوکا کھائے ہوئے ہیں یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ اسم اللہ کے ذکر کرنے کے لئے کئی جگہ آیات بینات محکمہ بلا تاویل موجود ہیں۔

(۱) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف
اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا۔ (مزمل) سب سے الگ ہو جا الگ ہو جانا

(۲) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر صبح
وَّاَصِيْلًا۔ (الدھر) اور شام۔

(۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ بے شک نجات پا گیا وہ جو پاکیزہ ہوا اور اپنے
اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ) رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔

(۴) وَيُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ اور اُن میں اللہ کے نام کا ذکر بہت کیا
كَثِيْرًا۔ (حج) وغیرہ وغیرہ جاتا ہے۔

پھر ذکر کثیر کا لفظ خود بھی اتنا جامع مانع ہے۔ کہ کوئی دوسری چیز نماز وغیرہ اس شمار میں نہیں آسکتی۔ صرف ذکر کثیر۔ خود بتلاتا ہے۔ کہ اللہ اللہ کرنا مراد ہے۔

بھیجتے ہیں۔ تاکہ تم اندھیروں سے نکل کر نورِ حق دیکھ پاؤ۔ غرض ذکرِ کثیر رحمتِ الٰہی اور اس
کی پاک مخلوق نوری کی رحمتوں کا باعث ہوتا ہے۔

دل خواہشات سے نکل کر انوار میں داخل ہو تو یہی معرفتِ الٰہی ہے

اور جب رحمتِ الٰہی متواتر انسانی دل پہ وارد ہوتی ہے۔ تو دل بشری ظلمات
یعنی خواہشات نفسی کے اندھیروں سے نکل کر تجلیات الٰہی کے انوار میں داخل ہو
جاتا ہے۔ یہی طریقت و معرفت ہے۔ اسلام صرف شرائع نہیں سکھاتا۔
شرائع کے ساتھ باطن کو انوار معرفت سے روشن کرنا چاہتا ہے۔

احکامِ شریعت معرفت کا پہلا قدم ہے

شریعت بے شک پہلا قدم معرفتِ الٰہیہ کا ہے لیکن صرف شریعت کے
احکامِ ظاہریہ اس نورِ مطلق تک نہیں پہنچاتے۔ جب تک احکام سے بڑھ کر دل کی
توجہ اس ذات اقدس کی طرف نہ بڑھے۔ اور یہ حاصل ہوتی ہے۔ ذکر کثیر سے۔ جیسے آج
کی اسلامی دنیا ایک عبث فعل خیال کرتی ہے۔

سلاطینِ عالم ذکر کے نور کے سامنے جھک گئے

عام خیال یہ ہے۔ کہ الفاظ کی رٹ سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بے شک عام
الفاظ کی رٹ سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہوگا لیکن اللہ کے نام کی رٹ کبھی بھی ضائع
نہیں ہوتی۔ لاکھوں نہیں کروڑوں انسان صرف اسی رٹ سے خدائے قدوس کی

معرفت تک پہنچ گئے۔ تاریخ شاہد ہے۔ اور دنیا گواہ۔ سلاطینِ عالم ان کے سامنے جھکے۔ اور صرف مسلمان بادشاہ نہیں بلکہ غیر مسلمین بھی ان کے سامنے سر جھکا گئے۔ کیوں؟ خاکی پتلے کے لئے یا اس نورِ مطلق کی روشنی کی وجہ سے جو اس خاکی پتلے کے اندر ذکر و تسبیح سے چمک اٹھی؟۔

ے یادِ او سرمایۂ ایماں بود ہر گدا از یادِ او سلطاں بود

موسٰی علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس کیوں جانا پڑا

بہر صورت جو یہ کہا جاتا ہے کہ احکامِ شریعت کے سوا طریقت کچھ اور نہیں۔ یہ آیات کھلے طور بتلاتی ہیں۔ کہ موسٰے علیہ السلام خود شریعت کے مالک تھے۔ پھر بھی ان کو طریقت کی طرف قدم اٹھانے کے لئے حکم فرمایا گیا۔ اس لئے ہر اُس نفس پر جو اللہ تعالٰے کے معارف دیکھنا چاہتا ہے اس کے لئے شریعت سے آگے ایک اور قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اور اسی ضرورت کے لئے مولائے کریم نے موسٰے علیہ السلام کی توجہ کو اٹھایا۔

مرشد کی ضرورت

موسٰی علیہ السلام خود خالقِ حقیقی سے کلام فرماتے تھے۔ خود صاحبِ کتاب تھے۔ الہام وحی سے تعلیم دلائی جاسکتی تھی لیکن ایسے نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود انہیں جیسے انسان کو جسے اپنے علمِ حقیقی سے سرافراز فرمادیا گیا تھا اُن کی تربیتِ طریقت کے لئے منتخب فرمایا۔ پھر نام و نشان تو نہیں بتلایا۔ ہاں نشانات دئے اور ایسے

پہنچنے دیئے۔ کہ کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ تھی کرامت جس سے ایک مچھلی زندہ ہو گئی لیکن اب کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن حکیم کے ہوتے کسی دوسرے مرشد کی کیا ضرورت قرآن حکیم سے بڑھ کر کون مرشد ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کرامت کامل مرشد کا نشان ہے

اکثر احباب سے سنتا ہوں۔ کہ کرامت کا ولی کے لئے ہونا ضروری نہیں۔ ایسا ہی ہوگا لیکن نشانِ ولایت کیا ہوگا۔ نماز و روزے کے نشانات ان لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن کو خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم قتل فرمایا تھا اور بسا اوقات تجربہ میں بھی آتا رہتا ہے۔ کہ بعض نفوس شرائع کے پابند ہونے کے باوجود اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں لیکن آپ کہیں گے ایسے ہی طریقت والے بھی آج کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لئے یہ قید کرامت رکھی گئی ہے۔ کہ دھوکے باز الگ ہو جائیں بعض شعبدہ باز چالاکی سے کچھ دھوکے دے جاتے ہیں جس سے ایک عامی دھوکا کھا جاتا ہے۔

لیکن کرامت کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسکے اندر رشد عالی بھی ہے۔ یا کذاب، مفتری شیطان ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

مرشد برحق کے کارنامے

مُرشد عالی چھپتا نہیں۔ اُس کی ہر ادا [۱] ہر لفظ رُشد ہوتا ہے۔ اور ہدایت [۲] بخشتا ہے، دلوں کو نرم کرتا ہے۔ عقلوں [۳] کو صاف کرتا ہے۔ اخلاق [۴] سنوارتا ہے۔ دل کو مولیٰ [۵] کریم کی محبت [۶] حقہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آنکھوں [۷] کو حیا سے پُر کرتا ہے۔ کانوں [۸] کو اور زبان کو لغویات کے سننے اور بولنے سے بند کرتا ہے۔ اور اپنے مولا [۹] کی محبت کے سوا دل میں کچھ نہیں چھوڑتا۔ اور دنیا [۱۰] و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ اور صراط [۱۱] مستقیم کو روز روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے اور اس پر چلنے کے لئے سالک کو مستعد کر دیتا ہے اور جو خدمت [۱۱] عالیہ میں پہنچا، یادِ حق کی دولت سے مالا مال واپس ہوا۔ مرتے [۱۲] دم تک اُس کی محبت کا نشہ دل و جسم کو کھاتا رہتا ہے۔ اَلَا [۱۳] بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔

فیض ظاہر و باطن کی تقسیم

پھر جوں جوں نیابت میں فاصلے پیدا ہوتے گئے۔ اور زمانۂ نبوت کو دُوری ہوتی گئی۔ تو نبوت کے آثار و نشانات کے اثرات بھی اکٹھے ظہور پذیر ہونے مشکل ہو گئے۔ اور اللہ کریم نے یہ دولت مختلف نفوس پاک میں تقسیم فرما دی۔ کسی کو شریعت حقہ کے علوم کا عالم بنایا۔ اور فقہ کی تدوین کے سامان پیدا ہوئے۔ اور کسی کو باطن کے ساتھ زیادہ مناسبت عنایت فرمائی۔ اور سینۂ انور [۱] سے زیادہ انوار و فیوض اسکے سینہ میں آ گئے۔ اور تصوف کی آبیاری کے سامان اکٹھے ہونے لگے۔

بیعت طریقت کا ثبوت قرآن حکیم میں

اب پہلی نسبت اسلامی تو مسلمان گھر میں پیدا ہونے پر باقی رہی لیکن دوسری

---

[۱] سینۂ انور سے مراد سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک ہے۔

نسبت کے لئے جن کو اس راہ کے لئے چُنا گیا۔ وہ صاحبِ طریقت کی خدمت
میں پہنچ کر اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے از سرِ نو ایک معاہدہ طریقت میں داخل
ہوئے۔ جیسے موسٰے علیہ السلام باوجود صاحبِ کتاب ہونے کے مجبور ہو گئے
کہ بارگاہِ خضر میں عرض کریں۔ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ
رُشْدًا ہ (کہے تو تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ رُشد
جو سکھائی گئی تجھ کو)
دیکھئے کس پر معاہدہ ہو رہا ہے۔ صرف رُشد پر۔ کہ جو رُشد تجھے اللہ تعالیٰ نے
عنایت فرمایا اُس میں سے کچھ عنایت ہو۔ تمام کا حاصل ہونا تو کجا۔ ایک موہبتِ
عظمٰے بھی ہوتی ہے۔ جو فطرتاً کسی کی فطری مناسبت ہوتی ہے لیکن اگر فطرت
کمالِ استعداد نہ رکھتی ہو۔ تو پھر بھی صحبت کے اثرات سے اور تعلیم و تعلّم کی وجہ
سے کچھ نہ کچھ صاحبِ اسناد سے حاصل ہو جاتا ہے۔

علمِ لدُنّی

لدُنّی علم کی بات سے بچپن سے کان آشنا چلے آتے ہیں لیکن حقیقت
نہیں کھلتی تھی۔ اب کوئی اتنی واضح بات تو نہیں کہی جا سکتی جتنی صاحبِ علمِ لدُنّی
بیان کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے۔ جو صاحبِ علم ہی اس کی بابت خود
اندازہ کر سکتا ہے اور کسی دوسرے پر سوائے آثار و نشانات کے کچھ دیکھا نہیں جا سکتا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

علم دوست حضرات کے نزدیک تو اس علم کی کوئی اہمیت نہیں۔ بلکہ علمِ شریعت

کے سوا ان کے نزدیک کوئی دوسرا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ اور کسی دوسرے علمِ الٰہی کی بابت کچھ سُننا گوارا نہیں کرتے لیکن قرآن حکیم نے اس قصہ میں ایک واضح حقیقت اس علمِ لدُنّی کی پیش کر دی۔ اور علمِ شریعت کے سوا ایک دوسرا علمِ الٰہی مقابلتاً پیش فرما دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام علمِ شریعت کے مالک ہی نہ تھے بلکہ علمِ شریعت میں توراۃ جیسی مکمل کتاب ان پر نازل فرمائی گئی تھی لیکن اس صاحبِ علمِ لدُنّی کی خدمت میں ان کو بھیجا گیا۔ کیوں؟ صرف رُشد حاصل کرنے کے لئے۔

رُشد اور علم کا فرق

اور رُشد علم ہی نہیں۔ بلکہ علم سے حاصل شدہ ہدایت کا نام ہے۔ اس کو علم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ علم ہدایت بھی بخشتا ہے۔ اور ضلالت بھی۔ ابلیس کا علم تمام سے زیادہ تھا لیکن علم نے ہی استکبار پر اسے اُبھارا۔ اور اُس گمراہی میں ڈالا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور کھلے خدائی احکام سے سرتابی کی۔ اس لئے ہم کھلے طور پر کہتے ہیں۔ کہ یہ بھی ایک کھلا دھوکا ہے۔ جو علم کو رُشد کے برابر جانتا ہے۔ قرآن حکیم ہدایت سے بھرپور ہے لیکن لازم ملزوم کے تعلق سے۔

طریقت کی بیعت کیا ہے

ایسے ہی رُشد بھی علم سے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کے سوا بھی رُشد حاصل ہو سکتا ہے۔ نبیوں کا رشید ہونا علم کے سوا موجود ہوتا ہے۔ اسلئے یہ طریقت

اُٹھ گئے۔ (غرض استعدادی معاملہ ہے) اور کہیں سالوں مجاہدہ کے بعد ایک پردہ بھی نہیں اُٹھا۔

رُشد و ارشاد سے بڑھ کر کونسی خدمتِ خلق ہے

ہاں عام جذبۂ خدمت سے بزرگانِ طریقت معمور ہوتے ہیں۔ اور رُشد و ارشاد خود کیا ہے؟ یہی خدمتِ خلق اِس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ کہ خلقِ خدا کو غلط راستے سے صحیح راستے پر گامزن کر کے اس کو اندھیرے گھپ سے نکال کر نورِ الٰہی کی طرف پھیر دیا جائے

ذکرِ الٰہی ہی سالک کا راس المال ہے

لیکن قرآنِ حکیم اور بزرگانِ سلف رحمہم اللہ علیہم اجمعین نے اس راہِ طریقت کے حصول کے لئے اور معرفتِ الٰہیہ کے لئے ذکر و فکر کو بڑا درجہ دیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جتنا زور ذکرِ الٰہی پر ہے۔ شاید کسی دوسرے عمل پر اتنا نہ ہوگا۔ کیونکہ مسلمان کا راس المال افضل الذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے اور اسی پر دار و مدارِ ایمان ہے۔ سرِدست ہم چند آیات پیش کرتے ہیں۔

پارہ ۲۲ سورہ احزاب آیات ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ -

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۙ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۞ هُوَ الَّذِىْ

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کو بہت یاد اور پاکی بولو صبح و شام وہی ہے جو

يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ رحمتیں بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ کہ نکالے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں۔
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۔ اور ایمان والوں پر مہربان ہے۔

ذکر کثیر سے دل منور ہوتا ہے

ذکر کثیر یعنی بہت ذکر کرنے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی تسبیح و تہلیل پڑھنے کا۔ اس لئے کہ مولیٰ کریم اور اس کے فرشتے ہر وقت تم پر اپنی طرف سے رحمتیں

۱؎ بعض علم دوست حضرات اس ذکر سے کوئی دوسرا ذکر (صرف نماز) مراد لیتے ہیں اور اللہ اللہ کرنے کو ایک فعل عبث قرآن پاک کے برخلاف جانتے ہیں۔ خود دھوکا کھائے ہوئے ہیں یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ اسم اللہ کے ذکر کرنے کے لئے کئی جگہ آیات بینات محکمہ بلا تاویل موجود ہیں۔

(۱) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف
اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۔ (مزمل) سب سے الگ ہو جا الگ ہو جانا

(۲) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر صبح
وَّاَصِيْلًا ۔ (الدھر) اور شام۔

(۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ بے شک نجات پا گیا وہ جو پاکیزہ ہوا اور اپنے
اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ) رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔

(۴) وَيُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ اور ان میں اللہ کے نام کا ذکر بہت کیا
كَثِيْرًا ۔ (حج) وغیرہ وغیرہ جاتا ہے۔

پھر ذکر کثیر کا لفظ خود بھی اتنا جامع مانع ہے۔ کہ کوئی دوسری چیز نماز وغیرہ اس شمار میں نہیں آسکتی۔ صرف ذکر کثیر۔ خود بتلاتا ہے۔ کہ اللہ اللہ کرنا مراد ہے۔

بھیجتے ہیں۔ تاکہ تم اندھیروں سے نکل کر نورِ حق دیکھ پاؤ۔ غرض ذکرِ کثیر رحمتِ الٰہی اور اس کی پاک مخلوق نوری کی رحمتوں کا باعث ہوتا ہے۔

دل خواہشات سے نکل کر انوار میں داخل ہو تو یہی معرفتِ الٰہی ہے

اور جب رحمتِ الٰہی متواتر انسانی دل پہ وارد ہوتی ہے۔ تو دل بشری ظلمات یعنی خواہشاتِ نفسی کے اندھیروں سے نکل کر تجلیاتِ الٰہی کے انوار میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی طریقت و معرفت ہے۔ اسلام صرف شرائع نہیں سکھاتا۔ شرائع کے ساتھ باطن کو انوارِ معرفت سے روشن کرنا چاہتا ہے۔

احکامِ شریعت معرفت کا پہلا قدم ہے

شریعت بے شک پہلا قدم معرفتِ الٰہیہ کا ہے لیکن صرف شریعت کے احکامِ ظاہریہ اس نورِ مطلق تک نہیں پہنچاتے۔ جب تک احکام سے بڑھ کر دل کی توجہ اس ذاتِ اقدس کی طرف نہ بڑھے۔ اور یہ حاصل ہوتی ہے۔ ذکرِ کثیر سے۔ جسے آج کی اسلامی دنیا ایک عبث فعل خیال کرتی ہے۔

سلاطینِ عالم ذکر کے نور کے سامنے جھک گئے

عام خیال یہ ہے۔ کہ الفاظ کی رٹ سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بے شک عام الفاظ کی رٹ سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہوگا لیکن اللہ کے نام کی رٹ کبھی بھی ضائع نہیں ہوتی۔ لاکھوں نہیں کروڑوں انسان صرف اسی رٹ سے خدائے قدوس کی

معرفت تک پہنچ گئے۔ تاریخ شاہد ہے۔ اور دنیا گواہ۔ سلاطینِ عالم ان کے سامنے جھکے۔ اور صرف مسلمان بادشاہ نہیں۔ بلکہ غیر مسلمین بھی ان کے سامنے سر جھکا گئے۔ کیوں؟ خاکی پتلے کے لئے یا اس نورِ مطلق کی روشنی کی وجہ سے جو اس خاکی پتلے کے اندر ذکر و تسبیح سے چمک اٹھی؟۔

ے یادِ او سرمایۂ ایماں بود   ہر گدا از یادِ او سلطاں بود

موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس کیوں جانا پڑا

بہر صورت جو یہ کہا جاتا ہے کہ احکامِ شریعت کے سوا طریقت کچھ اور نہیں۔ یہ آیات کھلے طور بتلاتی ہیں۔ کہ موسےٰ علیہ السلام خود شریعت کے مالک تھے۔ پھر بھی ان کو طریقت کی طرف قدم اٹھانے کے لئے حکم فرمایا گیا۔ اس لئے ہر اُس نفس پر جو اللہ تعالےٰ کے معارف دیکھنا چاہتا ہے اس کے لئے شریعت سے آگے ایک اور قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اور اسی ضرورت کے لئے مولائے کریم نے موسےٰ علیہ السلام کی توجہ کو اُٹھایا۔

مرشد کی ضرورت

موسیٰ علیہ السلام خود خالقِ حقیقی سے کلام فرماتے تھے۔ خود صاحبِ کتاب تھے۔ الہام وحی سے تعلیم دلائی جا سکتی تھی لیکن ایسے نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود انہیں جیسے انسان کو جسے اپنے علمِ حقیقی سے سرافراز فرمایا گیا تھا اُن کی تربیتِ طریقت کے لئے منتخب فرمایا۔ پھر نام و نشان تو نہیں بتلایا۔ ہاں نشانات دئے اور ایسے

پُختہ دے ئے۔ کہ کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ تھی کرامت جس سے ایک مچھلی زندہ ہو گئی لیکن اب کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن حکیم کے ہوتے کسی دوسرے مُرشد کی کیا ضرورت قرآن حکیم سے بڑھ کر کون مرشد ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کرامت کامل مرشد کا نشان ہے

اکثر احباب سے سُنتا ہوں۔ کہ کرامت کا ولی کے لئے ہونا ضروری نہیں۔ ایسا ہی ہو گا لیکن نشانِ ولایت کیا ہو گا۔ نماز و روزے کے نشانات ان لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن کو خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ قتل فرمایا تھا اور بسا اوقات تجربہ میں بھی آتا رہتا ہے۔ کہ بعض نفوس شرائع کے پابند ہونے کے باوجود اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں لیکن آپ کہیں گے ایسے ہی طریقت والے بھی آج کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لئے یہ قید کرامت رکھی گئی ہے۔ کہ دھوکے باز الگ ہو جائیں بعض شعبدہ باز چالاکی سے کچھ دھوکے دے جاتے ہیں جس سے ایک عامی دھوکا کھا جاتا ہے۔

لیکن کرامت کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسکے اندر مُرشد حقانی بھی ہے۔ یا کذاب، مفتری شیطان ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

مرشد برحق کے کارنامے

مُرشد عالی چھپتا نہیں۔ اُس کی ہر ادا ہر لفظ رُشد ہوتا ہے۔ اور ہدایت بخشتا ہے، دلوں کو نرم کرتا ہے۔ عقلوں کو صاف کرتا ہے۔ اخلاق سنوارتا ہے۔ دل کو مولیٰ کریم کی محبت حقہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آنکھوں کو حیل سے پُر کرتا ہے۔ کانوں کو اور زبان کو لغویات کے سننے اور بولنے سے بند کرتا ہے۔ اور اپنے مولا کی محبت کے سوا دل میں کچھ نہیں چھوڑتا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ اور صراط مستقیم کو روز روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے اور اس پر چلنے کے لئے سالک کو مستعد کر دیتا ہے۔ اور جو خدمت عالیہ میں پہنچا، یادِ حق کی دولت سے مالا مال واپس ہوا۔ مرتے دم تک اُس کی محبت کا نشہ دل و جسم کو کھاتا رہتا ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔

فیض ظاہر و باطن کی تقسیم

پھر جوں جوں نیابت میں فاصلے پیدا ہوتے گئے۔ اور زمانہ نبوت کو دوری ہوتی گئی۔ تو نبوت کے آثار و نشانات کے اثرات بھی اکٹھے ظہور پذیر ہوتے مشکل ہو گئے۔ اور اللہ کریم نے یہ دولت مختلف نفوس قدسیہ میں تقسیم فرما دی۔ کسی کو شریعت حقہ کے علوم کا عالم بنایا۔ اور فقہ کی تدوین کے سامان پیدا ہوئے۔ اور کسی کو باطن کے ساتھ زیادہ مناسبت عنایت فرمائی۔ اور سینہ انور[1] سے زیادہ انوار و فیوض اسکے سینہ میں آ گئے۔ اور تصوف کی آبیاری کے سامان اکٹھے ہونے لگے۔

بیعت طریقت کا ثبوت قرآن حکیم میں

اب پہلی نسبت اسلامی تو مسلمان گھر میں پیدا ہونے پہ باقی رہی لیکن دوسری

---

[1] سینہ انور سے مراد سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک ہے۔

نسبت کے لئے جن کو اس راہ کے لئے چنا گیا۔ وہ صاحب طریقت کی خدمت

میں پہنچ کر اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے ازسرِ نو ایک معاہدہ طریقت میں داخل

ہوئے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام باوجود صاحب کتاب ہونے کے مجبور ہو گئے

کہ بارگاہِ خضر میں عرض کریں۔ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ

رُشْدًا ۝ (کیا تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ رُشد

جو سکھائی گئی تجھ کو)

دیکھئے کس پر معاہدہ ہو رہا ہے۔ صرف رُشد پر۔ کہ جو رُشد تجھے اللہ تعالیٰ نے

عنایت فرمایا اس میں سے کچھ عنایت ہو۔ تمام کا حاصل ہونا تو کجا۔ ایک موہبتِ

عظمیٰ بھی ہوتی ہے۔ جو فطرتاً کسی کی فطری مناسبت ہوتی ہے لیکن اگر فطرت

کمالِ استعداد نہ رکھتی ہو۔ تو پھر بھی صحبت کے اثرات سے اور تعلیم و تعلم کی وجہ

سے کچھ نہ کچھ صاحبِ سند سے حاصل ہو جاتا ہے۔

علمِ لدنّی

لدنّی علم کی بات سے بچپن سے کان آشنا چلے آتے ہیں لیکن حقیقت

نہیں کھلتی تھی۔ اب کوئی اتنی واضح بات تو نہیں کہی جا سکتی جتنی "صاحبِ علمِ لدنّی"

بیان کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے۔ جو صاحبِ علم ہی اس کی بابت خود

اندازہ کر سکتا ہے اور کسی دوسرے پر سوائے آثار و نشانات کے کچھ دکھایا نہیں جا سکتا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

علم دوست حضرات کے نزدیک تو اس علم کی کوئی اہمیت نہیں۔ بلکہ علم شریعت

کے سوا ان کے نزدیک کوئی دوسرا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ اور کسی دوسرے علمِ الٰہی کی بات کچھ سُننا گوارا نہیں کرتے لیکن قرآن حکیم نے اس قصہ میں ایک واضح حقیقت اس علم لدُنّی کی پیش کر دی۔ اور علمِ شریعت کے سوا ایک دوسرا علمِ الٰہی مقابلتاً پیش فرما دیا۔ حضرت موسٰے علیہ السلام علمِ شریعت کے مالک ہی نہ تھے بلکہ علمِ شریعت میں توراۃ جیسی مکمل کتاب ان پر نازل فرمائی گئی تھی لیکن اس صاحبِ علمِ لدُنّی کی خدمت میں ان کو بھیجا گیا۔ کیوں؟ صرف رُشد حاصل کرنے کے لئے۔

رُشد اور علم کا فرق

اور رُشد علم ہی نہیں۔ بلکہ علم سے حاصل شدہ ہدایت کا نام ہے۔ اس کو علم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ علم ہدایت بھی بخشتا ہے۔ اور ضلالت بھی۔ ابلیس کا علم تمام سے زیادہ تھا لیکن علم نے ہی استکبار پر اسے اُبھارا۔ اور اُس گمراہی میں ڈالا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور کھلے خدائی احکام سے سرتابی کی۔ اس لئے ہم کھلے طور پر کہتے ہیں۔ کہ یہ بھی ایک کھلا دھوکا ہے۔ جو علم کو رُشد کے برابر جانتا ہے۔ قرآن حکیم ہدایت سے بھرپور ہے لیکن لازم ملزوم کے تعلق سے۔

طریقت کی بعیت کیا ہے

ایسے ہی رُشد بھی علم سے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کے سوا بھی رُشد حاصل ہو سکتا ہے۔ نبیوں کا رشید ہونا علم کے سوا موجود ہوتا ہے۔ اسلئے یہ طریقت

کی بیعت، احکامِ الٰہیہ کے جاننے پہچاننے کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ رُشد حاصل کرنے کے لئے۔

رُشد کا ترجمہ ایک مترجم نے بھلی راہ لکھا ہے۔ پس سے بلند بھی کوئی ترجمہ ہونا چاہیئے۔ جو لفظ رُشد کے ساتھ برابری کر سکے۔

بیعت کی اصل

عام اعتراض ہے۔ کہ بیعتِ اسلام کے سوا کوئی دوسری بیعت نہیں۔ اور یہ کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی دوسری بیعت نہیں لی۔ اوّل تو نبوّت چونکہ سراسر چشمۂ نورِ ہدایت ہوتا ہے۔ اور جہاں اسلام کی بیعت لی گئی۔ وہاں سے طریقت کی بیعت خود بخود ہوتی گئی۔ اور اپنی استعداد کے مطابق ہر صحابی نے صلاحیّت اور رُشد حاصل کیا۔ جہاں وہ علومِ شرعیہ سے واقف ہوئے۔ وہاں تزکیّہ کی دولت بھی ساتھ حاصل ہوتی گئی۔ اور حکمت بھی آ گئی۔ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح ۱۲)

ترجمہ:۔ جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے وہ ہاتھ ملاتے ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ اوپر ان کے ہاتھ کے ہے۔

فرمائیے اب یہ دولت کیسے حاصل ہوئی۔ نبی کریم کے ہاتھ سے ہاتھ ملانا۔ جو سراسر خود نور تھے۔ اور اس نور پر نورِ مطلق کا ساتھ خصوصی تھا۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا جس نے تجھ سے ہاتھ ملائے اس نے اللہ سے ہاتھ ملائے۔ اور اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہو جائے اسے پھر کسی دوسرے

سے ہاتھ ملانے کی کیا ضرورت ہے۔

تصوّفِ قدیم اور بعد کے تصوّف میں فرق

نبوت کے انوار سے کسی کا نور کتنا بھی مشابہت رکھتا ہو لیکن وہ اور، یہ اور۔ پھر بعد نبوّت نے آثار و نشانات اور انوار کے اندر کئی صورتیں پیدا کردی ہیں۔ موجودہ تصوف کتنا ہی بلند خیال کر لیا جائے۔ اس تصوف سادہ کے ہم رنگ ہونا محال۔ گو خیالات۔ پرواز۔ اور تصورات ہیں کتنا ہی وسیع اور بلند کیوں نہ نظر آئے۔

بیعت کا بہترین مفہوم

بیعت کا لفظ بیع سے ہے۔ جیسے خرید و فروخت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلامی بیعت کے لئے یہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا۔ کہ ایک گونہ نفس انسانی اپنی ذات کو ذاتِ حق جل و علا کے لئے فروخت کر دیتا ہے۔ اور اس معاہدہ اسلامی کو بیعت کا نام دیا گیا۔

حدیبیہ کے مقام پر جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ معظمہ کے رؤسا کے پاس رسالت کے فرائض سرانجام دینے کے لئے بھیجا۔ تو آپؐ نے اس جنگ کے لئے بیعت لی۔ اور اس میں تمام نے حضرت رسالت پناہی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور خود جناب رسالت پناہی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ اپنا اور دوسرے کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تصور کرتے ہوئے اُن کی بیعت کا اعلان فرمایا۔

بیعت اسلام میں داخل ہونے کے لئے تھی

جہاں دوسرے مذاہب میں مذہب کے اندر داخل ہونے کے لئے کچھ رسوم ظاہریہ تجویز شدہ ہیں۔ ایسے ہی اسلام میں بعض امور کو قبول کرنے کے لئے بیعت کی بنیاد پڑ گئی۔ مثلاً بیعت خلافت تو عام شروع ہی میں اسلام کے اندر دکھائی دیتی ہے۔ جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا۔ تو خلیفہ اول کے ہاتھ پہ مسلمانوں نے بیعت کی یہاں تک کہ خورد و کلاں اس بیعت سے سرفراز ہوئے۔ ایسے ہی یکے بعد دیگرے چلا آیا اور بعد میں جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ تو پرانے طریقہ پہ ملوک اسلام بھی بیعت لیتے تھے۔ اور بیعت ہی پہ خلافت یا ملوکیت کا دارومدار ہوتا تھا۔

بیعتِ طریقت بھی ایک عہد ہے

اسی طرح طریقت کے اندر بھی ایک دوسری بیعت چل گئی۔ اور وہ تھی بیعتِ طریقت۔ اور یہ تھا معاہدہ اتباعِ طریقت کا۔ یعنے پیرو مرشد کے فرمان پہ چلنے کا۔ دوسری بیعتوں کی رسم تو ختم ہو گئی لیکن طریقت کی بیعت آج تک اپنی پوری شان کے ساتھ چلی آتی ہے۔ اور جو بھی کوئی سالک اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے بیٹھتا ہے۔ تو پھر اسکے حکم اور اوامر کے نبھاؤ کی انتہائی کوشش میں رہا۔ یہاں تک کہ خود مرشد و شیخ[1] ہو بیٹھے۔

[1] یعنی رشد دارشاد کا راستہ خود مرشد چھوڑ بیٹھے

موجودہ بیعت کا ایک نقص

"تاہم اگر کوئی بھی کسی ایسے مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے بیٹھے جسے بعض عیوب سے اچھا نہ سمجھے۔ پھر بھی وہ سرتابی کو سرتابی طریقت خیال کرتا ہے حالانکہ یہ کھلی بات ہے۔ کہ جب پیرومرشد پر اس کی عظمت و عزت نہ رہے؟ تو مرشد کیسا اور مرید کیسا لیکن رسومِ جاہلیت کی طرح یہ رسمِ بد بھی طریقت میں اب پیدا ہوگئی ہے

مُرشد کون ہو سکتا ہے

کسی زمانے میں "مرشد" کی مسند پر وہی بیٹھتا تھا۔ جسے پیرومرشد پوری طرح طریقت کے مجاہدوں سے پاک کر کے اسے ارشاد کی اجازت دیتے تھے۔ پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے گھبراتا تھا۔ اور ارشاد کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ حتیٰ کہ مولائے کریم خود الہام فرماتے۔ اور اُس الہام سے نصرتِ الٰہی کا وعدہ فرماتے اُس وقت وہ سالک دعوت کا ہاتھ پھیلاتا۔ اور لوگوں کو تلقین فرماتا۔

مُرشد کی رُوحانی اولاد اور جسمانی اولاد

لیکن جیسے دوسرے امور میں بعض موقعہ پر رشتہ جسمانی بلند ہو کر خلق اللہ کی گمراہی کا باعث ہُوا۔ اسی طرح طریقت میں مُرشد کی اولاد و اقربا کے ساتھ بے انداز محبّت سے بھی اصل مقصد سے ہٹ کر ظاہری عقیدت پر اچھے لوگوں کا ایمان اکثر آتا ہے۔ اور پیرومرشد کے اظہار کے باوجود اولادِ مرشد پر ٹوٹتے اور ان کو صحیح مُرشد خیال

کہتے ہیں۔ مرشد کی اولاد کی عزت وعظمت طریقت میں واجب ہے لیکن مرشد عالی کی اولاد کی وجہ سے نہ طریقت کی وجہ سے۔ طریقت ایسی صورت میں یہ فتویٰ دیتی ہے۔ کہ جسمانی اولاد سے بڑھ کر روحانی اولاد مرشد کی طرف اپنا رخ بدل دیا جائے۔ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے حکم کے مطابق فوراً رخ بدلیں۔ اور کسی چون وچرا کے بغیر فوری حکم کی تعمیل کی جائے۔

بیعت کا اثر

عام خیال یہ ہے۔ کہ بیعت ظاہری سے کیا فائدہ لیکن قرآن حکیم میں خود اسی مفاد کو ظاہر فرماتے ہیں۔ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ[1] کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ[2] یعنی اس وقت اطمینان وآرام قلبی ان پر آجاتا ہے۔ اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔

حضوری کا اصل مفہوم

اب بھی کامل مرشد کی بیعت کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف بیعت کی۔ دوسری طرف اطمینان قلب نصیب ہو گیا۔ طبیعت یکسو ہو گئی۔

---

[1] ترجمہ: بے شک اللہ راضی ہوا مومنوں سے جب وہ آپ کی بیعت درخت کے نیچے کرتے تھے پس ان کے دلوں کی بات اللہ کے علم میں ہے۔

[2] ترجمہ: پھر اطمینان (السکینہ) ان پر نازل فرمایا۔

اور یادِ الٰہی کے اندر دل و جان غرق ہو گئے۔ حضرت سلطان باہور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ جو مرشد صرف بیعت پر ہی حضوری نہ کرے۔ وہ کیا مرشد ہو گا۔ حضوری کے معنے کوئی کچھ سمجھے۔ ہمارے خیال میں یہی اطمینان ہے۔ جس کے اندر انوارِ الٰہیہ کے شعلے روشن ہو نکلیں۔ بعض علم دوست حضرات کو سکینہ پر بھی شاید اعتراض ہو۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔ اس کی بابت خود قرآن حکیم کی آیت ملاحظہ ہو جو اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح فرماتی ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ

ترجمہ: مولا کریم وہ ذاتِ اقدس ہیں جو مومنین کے دلوں میں اطمینان اور صبر اتارتے ہیں تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ ایک اور ایمان بڑھ جائے۔

ایمان کی حقیقت

خود دیکھئے ایک ایمان اسلامی تو موجود ہوتا ہے سکینہ سے ایک ایمان ساتھ ہو کر پہلا ایمان تقویت میں دُگنا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جب بیعت کی جاتی ہے۔ تو مسلمان کے پہلے ایمان کے ساتھ سکینہ اطمینان و تسلی پیدا ہونے سے ایک اور ایمان دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے ایمان ایقان کے مدارج میں ترقی کر جاتا ہے۔ ایمان کیا ہے! یقین اور صرف یقین۔ ان عقائد پر جنہیں اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے ضروری قرار دیا۔

بیعت کو جو لوگ بدعت خیال کرتے ہیں۔ وہ کرتے پھریں لیکن قرآن حکیم سے سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ وہ کیا کچھ طلب کرتے ہیں جب

قرآن شہادت دیتا ہے۔ نبی کریم خود فرماتے ہیں خلفا کرتے آئے۔ تو اب اگر کوئی طریقت کی بیعت اسی طریقہ پر لے تو کیا حرج۔ ایک معاہدہ ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ اور جیسے نبھاؤ کے لئے پہلے ہی کہہ دیا گیا۔ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا۔ کسی صورت میرے ساتھ نہ نبھاؤ گے۔ حالانکہ خود حضرت نے عرض کیا تھا هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا۔ گویا موسیٰ علیہ السلام خود جانتے تھے۔ کہ یہ دولت اتباع کے بغیر ناممکن ہے۔ اور مرشد کا اتباع ہی ہے۔ جو یہ دولتِ عظمیٰ (رُشد) دلاتا ہے۔

طریقت میں چون وچرا کی اجازت نہیں

عظمت محبّت جب دل پر چھا جاتی ہے۔ اول تو دل پر ایک رُعب ایک حیا چھا جاتا ہے اور خود سالک کا دل خاموش ہو جاتا ہے۔ اور کسی سوال، کسی اعتراض کو اپنے اندر پا نہیں سکتا لیکن بعض طبائع من چلی ہوتی ہیں۔ اور اعتراض و شکوک ان کے اندر بہت اُٹھتے ہیں اس لئے طریقت کا فیصلہ یہ دلایا گیا۔ فَلَا تَسْـَٔلْنِي عَنْ شَيْءٍ۔ "تم مجھ سے کچھ نہ پوچھنا" حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا۔ جب تک میں خود نہ اسے کہوں۔ صاحبِ طریقت کے سامنے خاموشی، اور اس کے ہر امر کو ایک حقیقت سمجھا جائے اور اس کے کسی فعل پر اعتراض نہ رکھا جائے۔

چون وچرا اطمینان ضائع کر دیتا ہے

اس کا فلسفہ وہی ہے۔ کہ اگر تنقید کا رستہ کھلا رکھا جائے۔ اور ہر سالک کے

اعتراض پر دھیان دیا جائے۔ تو ایک تو سالک مطلق العنان ہوکر آوارہ ہو جائیگا۔
دوسرے خود مُربّی اور مرشد ہر وقت اس اُلجھاؤ میں پڑا رہے گا۔

فرماتے ہیں۔ لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ

(مومنو!) مت پوچھو بہت چیزیں۔ کہ اگر تم پر کھولے۔ تو تم کو بُری لگیں یعنی امور کی حقیقت مت دریافت کرو۔ اگر ان کی حقیقت تم پر کھول دی جائے۔ تو بعض وقت تم کو بُری معلوم ہوں گی۔ ہاں اگر نزولِ قرآن کے وقت دریافت کرو گے۔ تو اُن کی اصلیت ظاہر کر دی جائے گی مطلب یہ ہے حکم پر نہ پوچھو لیکن جب وقت ہو۔ تو دریافت پر بتلا بھی دی جائیں گی۔ جیسے خود خضرؑ فرماتے ہیں لَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ۔ پھر فرماتے ہیں۔ حَتّٰی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا۔

عموماً مرشد وہ حقائق جو کسی کی سمجھ میں بوقت امر و نواہی۔ یا بوقت کارکردگی نہیں کھلتے۔ جب وقت آتا ہے۔ اور طبیعت کھلتی ہے تو خود بیان کر دیتے ہیں۔ کہ اس حکمت سے یہ کام کرایا گیا۔ اور اس حکمت سے یہ کام نہ کیا۔

قصہ موسیٰؑ و خضرؑ میں خاموش رہنے کی حقیقت

خود قصہ یہی راز کھولتا ہے۔ کہ جب دریافت کیا۔ تو فرمایا خاموش! نہیں کہا گیا۔ کہ تم میرے معاملہ پر صبر نہ کرو گے لیکن جب کچھ ہو ہوا گیا۔ تو خود خضر صاحب نے تمام حقیقت کھول دی۔ اور بعد میں کہہ دیا۔ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ۔ میں نے اپنے ارادے سے یہ سب کچھ نہیں کیا۔

مُرشد کے سامنے تسلیم و رضا کی حکمتِ اعلیٰ

غرض طریقت میں اتباع کے ساتھ باطن کو بھی چون و چرا سے پاک رکھنا ضروری ہے اہلِ مقصود کو تسلیم و رضا کے سبق دلانے ہوتے ہیں۔ اور یہ سالک کو حکمِ الٰہی کے لئے بلا چون و چرا عمل میں لانے کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔ کہ حکمِ الٰہی پہ کوئی اعتراض اندر نہ اُٹھے۔ سراسر تسلیم و رضا ہو۔ اور مقدراتِ الٰہی پہ ایمان دار بنانے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ جب مرشد کے افعال و حرکات سراسر حکمت ہو جاتے ہیں۔ تو مولائے کریم خالق و رازق کے تمام احکام کیا تشریعی کیا تکوینی سراسر مصلحت نہ ہونگے؟

ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ بلکہ طبیعت کے اندر سے یہ بشری تقاضا بالکلیہ اُٹھ جاتا ہے۔ کہ یہ کیوں، اور وہ کیوں۔ سراسر حق۔ سراسر عدل۔ سراسر رحم نظر آتا ہے۔

لفظ مُرشد کا ماخذ

بعض علم دوست لفظ مرشد سے بھی گھبراتے ہیں۔ کہ یہ کیا لفظ ہے۔ نہ رسول نہ امام لیکن طریقت والوں نے اسی رُشد سے صاحبِ رُشد کے لئے مرشد کی اصطلاح اختیار کی جس کے معنے رہبر کے ہیں۔ اور ایک گونہ امتیاز کے لئے امام کے سوا دوسرا لفظ منتخب کر لیا گیا۔ ورنہ جو امام کا مفہوم ہے تقریباً یہی معنے یہ رکھتا ہے۔ تاہم حقیقت میں قدرے فرق ہے۔ اس وقت امام اور معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اور مرشد اور معنے میں۔ فرق گو بہت کم ہے۔

غیب دانی اور اولیاء اللہ

طریقت میں "غیب دانی" کا عقیدہ کچھ شریعت کے رُو سے نہیں بیٹھتا ہے۔ بلکہ واردات کی وجہ سے جب سالک عام تجربہ میں بعض امور کا انکشاف مرشد کی زبان سے سنتا ہے۔ اور بعض تنبیہہ یا حکم وہ سنتا ہے۔ جو عام ظہور میں نہیں آئے ہوتے۔ تو لامحالہ طبیعت میں اس قسم کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ میرا مرشد غیوب پر بھی نظر رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ عقیدہ کبھی بھی نہیں آتا۔ کہ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ بلکہ بعض اشیاءِ ضروریہ کا علم سامنے آجاتا ہے۔ جس سے ایک گونہ پیشگوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ کوئی اختیار کی بات نہیں۔ خود اسی قصہ میں حضرت خضرؑ کے کلمات ایسے ہیں جن سے غیب ٹپکتا ہے۔ جیسے بادشاہ کشتیاں بیگار میں پکڑے آتا ہے یا جیسے یہ لڑکا اپنے باپ دادا کو ذلیل کرنے کا باعث ہوگا۔ یا بچوں کا باپ نیک تھا۔ اور دیوار کے نیچے خزانہ ہے۔ خود سوچیے۔ جب کوئی یہ پوشیدہ باتوں کو کسی سے ظاہر ہوتا دیکھے۔ تو اس کے اس اظہار کو کیا نام دے۔ اور اس حقیقت کے لئے کیا لفظ استعمال کرے۔ کچھ بھی ہو۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں غیب کی جگہ کوئی اور لفظ ایسے اظہار کے لئے بنا لیا جاوے۔

امورِ منکرہ اور سالک

افعالِ قبیحہ بعض وقت جب سالک سے ظہور پکڑتے ہیں۔ تو صاحبِ شریعت پاسبانی شریعت کرتے ہوئے صاحبِ ولایت کو وہ کچھ سُناتے ہیں۔ جو کوئی

نہیں سُن سکتا۔ بلکہ دین و اسلام سے خارج کر دیتے ہیں لیکن خود یہ مطالعہ نہیں فرماتے۔ کہ اس کا ثبوت تو خود قرآنِ حکیم ہے۔ خود شہادت دیتا ہے۔ اور خود موسےٰ[۴۱] جیسے صاحبِ شریعت کو یہ معاملہ پیش آیا۔ تو قرآن حکیم نے صاحبِ ولایت کا دامن آلودہ ہونے سے ہی نہیں بچایا۔ بلکہ اس کے اس فعل کو ایک حکمتِ الٰہی اور ایک حکمِ الٰہی کا تصور دلاتے ہوئے صاحبِ ولایت کے علم کو علمِ لدُنّی سے تعبیر فرمایا ایسے ہی اگر ہمارے بزرگ ایسے موقع پر نیک تاویل لیں۔ تو قرآنِ کریم کی متابعت سے ان کو کتنا بلند درجہ ملے گا۔ اور مولا کریم کی قدرتِ کاملہ پر کتنا ایمان بلند ثابت ہونے کا اظہار ہوگا۔ عارف رومی نے اس مسئلہ کو خوب حل فرمایا ہے

گاہ چناں بنماید و گاہ ضدِ ایں جز کہ حیرانی نباشد کارِ دیں

یعنی کبھی تو شریعت کے احکام کا زور ہے۔ اور کبھی اس کے برخلاف ظہور کر کے مقدرات پیش کر دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے۔ کہ دین کا معاملہ حیرانی کے سوا کچھ نہیں۔ دیکھئے ضد کو بھی کارِ دین خیال فرمایا۔ ایسے ہی طریقت کے بعض نامناسب اور ناموافق امورات بھی حقیقتاً دین کا ایک جزو لاینفک ہیں اس کے سوا شریعتِ حقہ بھی مکمل نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو کچھ قرآنِ حکیم میں ہے۔ وہ سراسر شریعت ہے۔ اور یہ طریقت کی کارفرمائیاں جب خود ہی بیان فرماتے ہیں اور خود ہی اس کی تصدیق فرماتے ہیں۔ اور خود ہی انہیں اپنی طرف منسوب کرتے ہیں تو پھر کیونکر انہیں شریعتِ الٰہیہ سے باہر خیال کیا جاوے۔ گو ایک ظاہر بین اس کو شریعتِ الٰہیہ میں جگہ نہیں دے سکتا گرچہ ظاہر شریعت میں یہ امور ناپسندیدہ ہوں لیکن باطن بین آنکھیں کیوں اسے الگ کریں۔

معیّت کا درجہ

طریقت میں معیّت کو بڑا دخل ہے معیت کے معنے ساتھ رہنا ہے۔ جب انسان کسی انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ تو اس کے اخلاق و عادات سے بڑھ کر اس کے افکار پر اثر پڑتا ہے۔ اور جس درجہ صاحب معیت کے آثار۔ اخلاق۔ عادات اور افکار بلند ہوتے ہیں۔ اُسی درجہ کے عکس طالب طریقت کے اندر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور سالک اپنے مرشد طریقت کی معیت میں وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں اس کی استعداد خود اسے نہ پہنچا سکتی تھی۔

معیّت میں ایک بڑی مشکل

لیکن اس معیت میں سب سے بڑا مشکل امر یہ ہے۔ کہ بلا چون و چرا صاحبِ طریقت کی تابعداری کی جائے۔ اور اس کے ہر فعل کو صحیح خیال کیا جائے اور اس کے ہر فکر کو فکر بلند خیال کرتے ہوئے اسے اپنے دل میں جگہ دی جائے اور دل کے اندر اس معیت کے انوار درخشاں نظر آویں۔

مُرشد کے ہر فعل کو حکمتِ الٰہیہ تصور کیا جائے

غرضیکہ صاحبِ طریقت یا مرشد کو اپنے سے کہیں کثرت زیادہ علم و عمل اور فکر و نظر میں خیال کیا جاوے۔ اور اس کے ہر فعل کو حکمتِ الٰہیہ تصور کیا جاوے۔

معیّت میں صبر ہی مقصود ہے

ایک طرف حضرت موسےٰ علیہ السلام صاحب کتاب تھے۔ اور دوسری طرف حضرت خضر ایک اُمتی تھے۔ گو حکم مل چکا تھا۔ کہ انہیں استاد پکڑو۔ اور ان سے رہبری حاصل کرو لیکن ایک تو طبعی مناسبت نہ تھی۔ دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام اتنے بلند پایہ انسان ان کو خیال نہ کرتے تھے۔ گو حضرت موسےٰ علیہ السلام نے خود هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ۔ عرض کر دیا تھا لیکن فطرت شناس حضرت خضرعؑ نے فوراً جواب دیا۔ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے) اور اصل مقصود یہی معیّت کا تھا۔ کہ صبر ہو۔

(مَعِیَّتْ) معیت کے معنے "ساتھ ہونا" موسےٰ علیہ السلام نے خضرعؑ کی جناب میں عرض کیا (هَلْ اَتَّبِعُكَ) تیرے ساتھ رہوں۔ اور پھر خضرعؑ کا جواب لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا۔ (تم میرے ساتھ نہ رہ سکو گے)

کونوا مع الصّادقین سے مراد

یہ حکم قرآن پاک میں ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (سچوں کے ساتھ رہو) نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْهِ مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ (مجھے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت معیّت کا نصیب ہوتا ہے۔ کہ کسی مقرب فرشتہ یا مرسل نبی کو بھی اس وقت پسند نہیں کرتا۔

طریقت میں پہلی منزل صبر اور دوسری رضا ہے

صبر تو کیا تسلیم و رضا ہونی چاہیئے تھی۔ اور تسلیم و رضا بھی اس پر جس کی بابت علم نہ ہو۔ بلکہ اس علم کے برخلاف اندرونی جذبات ہوں۔ یہ طریقت کی ابتدائی بنیاد ہے۔ اور اسی تعلیم کے لئے حضرت موسےٰ (علیہ السلام) حاضر کیئے گئے تھے۔

قرآن حکیم میں کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ "کہ تم سچوں کے ساتھ رہو" کا حکم صریح ہے اس حکم پر جن بزرگوں نے عمل کیا۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیّت ہی نے صحابہ کو کیا سے کیا بنا دیا

صحابہ کرام کی دولت کیا تھی۔ یہی معیّت رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم۔ پہلے وہ کیا تھے گنوار تھے۔ بدوی تھے لیکن چند دن کی معیّت نے انہیں خدا سے ملا دیا۔ حکیم بنا دیا۔ عالم بنا دیا۔ جو کسی کے خیال میں نہ آتا تھا۔ وہ ان کے دل پر القا ہونے لگا۔ اور دنیا میں وہ کچھ ہو گئے۔ جو کسی بڑی سے بڑی درس گاہ کے اندر عمریں بسر کرنے سے نہ ہو سکتا تھا۔ فرماں برداری اور فرماں روائی دونوں میں وہاں جا پہنچے۔ جہاں کسی زمانے میں بھی ان کے ہم پلّہ ہونے کا خیال تک نہیں آتا

کامل کی معیّت سب کچھ بدل دیتی ہے

غرض طریقت کی تربیّت میں معیّت کو بڑا درجہ نصیب ہے۔ اکثر عارفین نے اپنے خواص کو ایک عرصہ تک اپنے ساتھ رکھا۔ اور شب و روز کی معیّت

نے ان کے اخلاق و عادات و افکار کو بدلنے میں حیرت انگیز اثرات دکھائے۔

معیّت میں تربیت کا طریقہ

پہلے زمانے میں خود مُرشد ایک جگہ رہنا پسند نہ فرماتے تھے۔ جیسے خضر علیہ السلام کے قصہ سے پتہ چلتا ہے۔ اور جیسے کتبِ تصوف میں اکثر اولیائے کرام کے حالات میں آتا ہے۔ خود بھی چلتے تھے اور خادمِ خاص بھی ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو کامل خیال کر کے ان کو کسی مقام میں رہنے کا حکم فرماتے۔ یا کسی طرف کوچ کرنے کا ارشاد ہوتا لیکن جب کسی بزرگ نے قیام فرما لیا تو پھر "معیّت" کے سبق دلانے کے لئے۔ خانقاہی طریقہ اختیار کیا۔ سالک جاتے۔ اور سالوں خدمت میں رہ کر معیّت کے فوائد اٹھاتے۔ اور کامل بنتے۔

خانقاہیّت کی حقیقت

آج کی دنیا میں بیکار خانقاہوں پر نظر ڈالتے ہوئے بعض علماء اعتراض کرتے ہیں۔ اور خانقاہی تصوّف کو بُرا خیال کیا جاتا ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ خانقاہی طریقہ کوئی آج کا نہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے چلا آتا ہے۔ اصحابِ صُفّہ کیا تھے۔ اور کیوں دربارِ رسالت سے چمٹے رہتے تھے۔ اور کیوں نانِ صدقہ پر گذران تھی۔ کیا بیکاری تھی یا کوئی خاص شغل محبّتِ الٰہیّہ تھا۔ محبّتِ الٰہیّہ کیا کچھ کم شغل ہے۔ خود سوچیئے۔ سچی محبّت اپنے سوا کچھ کرنے دیتی ہے؟ یا کچھ سُننے یا دیکھنے دیتی ہے؟ پھر کوئی محبّت کا مارا بیکار، اپنی نظر اس قدرت [illegible]

بیکاری سے وقت گذارے۔ تو ملامت کیسی۔ جب کسی دنیاوی یا حسینی محبت پر وقت ضائع کرنا خیال نہیں کیا جاتا۔

دنیا عجب ہے۔ اغراض۔ جو سراسر خود پرستی کے سوا کچھ نہیں ان خواہشات کے پورے کرنے میں جو وقت صرف کیا جاتا ہے۔ اسے عین شغل حیات خیال کیا جاتا ہے۔ اور جو شغل روحی زندگی کی تازگی کا باعث ہے۔ اسے عبث اور بے کاری خیال کیا جاتا ہے حالانکہ

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

محبّت کا جب وقت آتا ہے۔ تو سب کچھ ہیچ نظر آتا ہے۔ نبی مرسل اور فرشتے کتنے بلند درجہ کے ارواح عالم ہیں لیکن جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ محبّت کا وقت ہوتا تھا۔ تو کسی کی گنجائش نہ ہوئی۔ فرماتے ہیں۔ لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَّا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ وَّ لَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ۔ کہ مجھے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت محبّت نصیب ہوتا ہے۔ کہ کسی فرشتہ یا نبی مرسل کے لئے میرے پاس ان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

جو ہو رہا ہے سب کچھ مصلحت ہے

بہرصورت خضر علیہ السلام نے معیّت کی اجازت دیدی۔ تاکہ موسیٰ علیہ السلام اس دولت معیّت سے فائدہ اُٹھائیں۔ گو وہ جانتے تھے۔ کہ جس کی انہیں خبر نہیں۔

اور جس چیز کا انہیں علم نہیں دیا گیا اس پر کیسے خاموش ہو سکیں گے۔ حالانکہ مطلوب بھی یہی تھا۔ کہ بلا چون و چرا تسلیم و رضا کے مجسمہ بن جائیں۔ اور حکم الٰہی اور مشیت ایزدی کو سراسر حکمت خیال فرماتے ہوئے طریقت کے مصالح پر عبوری نظر حاصل کر لیویں۔

مصاحبت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں

سو طریقت کے اسباق حاصل کرنے کے لئے جو درجہ معیّت کو حاصل ہے وہ اور کسی چیز کو نہیں اس لئے طالب رُشد کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے مُربّی اور اپنے مُرشد کی معیّت حاصل کرے۔ اور مصاحبت میں اپنی پوری ہمت صرف کرے۔

ایک لطیفہ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی سے کسی نے آپ کی عمر دریافت کی۔ تو آپ نے فرمایا۔ تین سال۔ سننے والا حیرت میں آگیا۔ کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا سن تو بہت گذر چکا ہے۔ جواباً کہا کہ میری عمر وہی ہے جو پیر کی خدمت میں میں نے گذاری باقی وقت عمر کا ضائع کرنا تھا۔ جو سالک اپنا وقت پیر و مرّبی کی خدمت میں گذارتا ہے وہ اس دولت سے مشرف ہوتا ہے جیسے خاقانی نے بایں الفاظ ادا کیا۔

ع کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

باخدا بودن کی اصل حقیقت

باخدا بودن کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ اللہ اللہ زبان یا دل

سے کرنا دو باخدا بودن " ہے لیکن یہ سراسر نادانی و ناواقفی ہے۔ " باخدا بودن " کیا ہے
یہ معیّت اور مصاحبتِ الٰہیہ ہے۔ ایک طرف مولیٰ کریم اور دوسری طرف بندہ
اکٹھے بیٹھے جب نظر آویں۔ تو اسے معیّت کہا جاتا ہے۔ ویسے تو خدائے قدوس
کی معیّت ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن یہ معیّتِ خاصہ تو کسی کو نصیب ہوتی ہے قرآن
حکیم نبی کریم کی زبان سے بولتا ہے۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا صدیق اکبر کو فرمایا
جاتا ہے۔ یہ وہ معیّت نہیں۔ جو ہر آن اور ہر حال کائنات میں جاری و ساری ہے
جس کا علم کسی کو نہیں دیا جاتا۔ بلکہ یہ وہ معیّت ہے۔ جس کا علم صاحبِ معیّت کو
دیا جاتا ہے یعنی تینوں اکٹھے تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔ رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم اور اللہ جل شانہ غار میں یکساں اکٹھے تھے۔

معیّت کے آثار موجود ہوتے ہیں

شیخ کی معیّت و صحبت میں یہ دولت سالکین کو حاصل ہوتی ہے اور برابر حاصل
ہوتی رہتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ معیّتِ طریقت نصیب ہوئی۔ ان کے مشاہدات و
کیفیات قوم میں موجود ہیں۔ انہیں مطالعہ فرما کر دل کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔

معیّتِ موسوی

ویسے تو ذہن میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ معیّت بہت ہی کم رہی یعنے
ایک دن میں لیکن جیسے عام قصص قرآن حکیم میں مدت کا ذکر نہیں۔ اور واقعات
اکٹھے دیکھنے، پڑھنے والا خیال کرتا ہے۔ کہ آنی جانی ذکر ہے۔ لیکن واقعات کے مشاہدہ

کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ سالوں کے واقعات ایک بیان میں جب ایک گھڑی لکھدیتے ہیں۔ تو پڑھنے والا جانتا ہے کہ درمیان میں وقفہ نہیں۔ جیسے بنی اسرائیل کے واقعات کو جب یکدم پیش کیا جاتا ہے۔ تو سالوں کے عرصے اور مدت کا پتہ تک نہیں ملتا۔ اسی طرح یہ سیر میرے خیال میں ایک کافی عرصہ کا نچوڑ ہے کبھی کوئی واقعہ پیش آیا۔ اور کبھی پھر سفر کے بعد دوسرا۔ غرض یہ تین سفر الگ الگ ہیں اور ہر سفر کا ختم ایک واقعہ پر ہوتا ہے اس لئے یہ معیت اچھی خاصی رہی۔ چونکہ تعلیمی اسباق کا تعلق خاصکر واقعات عجیبہ سے تھا۔ وہ ذکر ہوئے اور دیگر اذکار چھوڑ دیئے گئے۔ اور اصل مطلب واقعہ کو بیان کر دیا گیا۔ مثلاً قتل کو ہی لیا جاوے۔ تو یہ ایک لفظ ہے لیکن قتل کرنے کا واقعہ کوئی اتنا مختصر نہیں۔ چنانچہ کہ الفاظ اس لئے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ کئی دنوں یا مہینوں کی معیت خضری رہی۔ واللہ اعلم۔ "فانطلقا" کا لفظ اسی پر دلالت کرتا ہے۔

اسباق تربیت کی غرض وغایت

کسی مفسر نے یہ نہیں لکھا۔ کہ ان واقعاتی اسباق سے حضرت موسےؑ کو کیا تعلیم وتربیت دلانی مقصود تھی۔ عام مفسرین تو صرف یہی لکھتے ہیں۔ کہ حضرت موسے علیہ السلام کو اپنے زیادہ اعلم ہونے کا خیال آیا۔ تو حضرت باری عزاسمہٗ نے ان کے اس گمان کو غلط کرنے اور اپنے خاص آدمیوں سے تعارف دلانے کے لئے ان کو خضری تعلیم دلائی۔ اور خضرؑ کے پاس روانہ کیا تاکہ اپنے اور ان کے علم کا مقابلہ کر کے عنایت الٰہیہ کا شکریہ ادا کریں۔ کیونکہ علمی حیثیت خضرؑ

کی کتنی بلند تھی! اور موسوی علم ان کے مقابلہ میں کتنا کم تھا لیکن منصب نبوّت کی بلندی خضری ولایت سے کتنی بلند تھی۔ کیا بات ہے! ایک کا علم زیادہ ہے لیکن منصبِ ولایت سے آگے قدم نہیں! اور ایک منصبِ نبوّت پر بیٹھ کر ایک امت کا امیر ہوتا ہے لیکن ایک صاحبِ ولایت سے علم میں کم۔ یہ اس سرکارِ عالی کی فیاضی اور اس کی حکمتِ بے پایاں جس تک عقول نہیں پہنچ سکتے۔

؎ گاہ چناں بنماید وگاہ ضدِ ایں　　　　جز کہ حیرانی نباشد کارِ دیں

اصل دین کیا ہے؟

اصل دین یہی ہے۔ کہ اس کے کارخانۂ قدرت سے حیرانی پیدا ہو جاوے اور اس کی ذات اقدس کی حکمت کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

؎ زیرکی بفروش و حیرانی بخر
گوش خر بگذار و دیگر گوش خر

توحیدِ تشریعی سے توحیدِ تکوینی کی جانب سفر

اور یہ اسباق کی غرض لم یزلی تھی یعنی توحیدِ تشریعی سے توحیدِ تکوینی کا سبق دینا مطلوب تھا۔ اور ظاہر سے آنکھ بند کرا کر باطن کی آنکھ کو روشن کرنا تھا۔ اور ہر فعلِ الٰہی اور مشیتِ ایزدی کو سراسر حکمت دکھانا مقصود تھا۔ ایک طرف نبی بھیجے تو دوسری طرف شیطان الرجیم کو کھڑا کر دیا۔ اور یہ کیوں؟ سراسر حکمت، سراسر مصلحت۔ اور جب تک یہ مصلحت عامہ سامنے نہ کرتے اس وقت تک توحید مکمل نہیں ہوتی۔

یہ خواص کا منصب ہے عوام کا نہیں

اچھے آدمیوں کو جب اللہ تعالٰی پسند فرماتا ہے۔ اور ان کو اپنا خاص بنانا چاہتا ہے۔ تو اپنی حکمتوں اور اپنے ارادوں سے ان کو مطلع کر دیتا ہے۔ تاکہ ان کی آنکھ میں اس کے کسی فعل کی برائی نظر نہ آئے۔ اور یہ ہے مسلمانی۔ اور اس درجہ پر ہر انسان کو لانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عوام و خواص میں پہلے تو فرق چاہیئے۔ اور دوسرا عوام کو عوام کے لئے چھوڑ دیا۔ کہ دنیا کے دھندے کریں۔ اور خواص کو اپنی بارگاہ کے مقرب بنا کر اپنے کار خاص کے لئے منتظر حکم و فرمان بنایا۔

ولایت کی حقیقت

اور یہ ہے اصل غرض و غایت طریقت۔ کہ جن کو اللہ تعالٰی اپنی راہ میں چن لے۔ اُن سے یہ دوسرا کام لیا جاتا ہے۔ جو خاصہ مقربین کا ہے۔ اسی کا نام دوسرے الفاظ میں ولایت ہے۔ اور ولی اللہ کے نام سے جو منسوب ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو مرکز انسانیت ہوتے ہیں۔ تمام انسانیت کی فلاح کے سرچشمے یہاں سے اُبلتے ہیں۔ اور تمام انسانی ہستی اچھی ہو یا بری۔ اِن سے فیضیاب ہوتی ہے۔

طبعی مناسبت

طبعی مناسبت جب تک کسی انسان میں نہ ہو اُنس پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ مناسبت ظاہری امور سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ باطنی جذبات میں مناسبت ہوتی

ہے۔ اندرونی جذبات جب ایک ہوں۔ اور مشاغل الگ الگ۔ تو جذباتی اتحاد ایک نقطہ پران کو قائم کردے گا۔ اور اگر مشاغل ایک ہوں یعنی ایک شغل ہیں ایک گروہ کام کرتا ہو لیکن اندرونی جذبات یا کیفیات۔ یا عقاید دینی الگ ہوں۔ تو وہ کبھی اتحاد و اتفاق کے مرکز شغل ہیں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یعنی شغل انہیں ایک نہیں کرسکتا ایک طرف کام اور شغل ختم ہوا۔ دوسری طرف بھاگڑ شروع ہوئی۔ بخلاف طبعی مناسبت کے جب موقع اپنے مشاغل سے ملے گا۔ اتحاد و اتفاق کی مجلس گرم ہو جائے گی۔ اور اپنے اندرونی جذبات کی تشنگی بجھانے کے لئے ایک دوسرے سے محبّت اور اخلاص کی باتیں کریں گے۔ اور تمام ایک دوسرے کے ہم آہنگ نظر آئیں گے۔

ظاہر و باطن ایک ساتھ نہیں چل سکتے ایک ضرور غالب ہوگا

موسٰے علیہ السلام کو حکم خداوندی سے خضرؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بڑی منّت سماجت اور بڑی کڑی شرائط پر مصاحبت کو حاصل کیا تھا لیکن دونوں میں مناسبت طبعی نہ تھی۔ ایک صاحبِ شریعت تھے۔ اور دوسرے صاحبِ تکوین۔ اس لئے باوجود حکمِ الٰہی اور باوجود مقصد بلند رکھنے کے موسٰے علیہ السلام سے نبھاؤ نہ ہو سکا۔ خضرؑ تو خود جانتے تھے کہ یہ نبھاؤ اُن سے مشکل ہے لیکن وہ بھی حکمِ خداوندی پورا کرنے اور اصل حقیقت مناسبت دکھانے اور تشریع و تکوین کے اختلافات ظاہر کرنے کے لئے بظاہر راضی ہو گئے۔ اور اپنے ساتھ لے چلے لیکن ہر موقع پر دونوں کی جھڑپ ہوتی گئی۔ اور آخر مناسبتِ باطنی نہ ہونے کی وجہ سے ھٰذَا فِرَاقُ

بَیْنِیْ وَ بَیْنِکَ“، کہہ کر الگ الگ ہو گئے۔ اس الگ ہونے کا نہ تو خضرؑ کو رنج تھا۔ اور نہ موسےٰ علیہ السلام کو پریشانی تھی۔ اگر قلبی مناسبت ہوتی۔ اول تو الگ ہونے کا خیال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اگر اسباب قدرتی پیدا بھی ہو جاتے۔ تو عمر بھر دونوں کو رنج ہوتا۔ کہ ہماری مصاحبت اور رفاقت پر کیا بلا پڑی۔ کہ دونوں کو جدا کر دیا۔

مُرید کی پیر سے طبعی مناسبت اُسے آناً فاناً کامل بناتی ہے

یہی حال طریقت کی مناسبت کا ہے۔ جب پیر و مرشد اور مرید کی مناسبت ہوتی ہے۔ تو مرید آناً فاناً ترقی کرتا ہوا آخری درجۂ محبت پر پہنچ جاتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی محبت میں ”لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ“ کی کیفیت اپنے اندر پاتا ہے۔ لیکن جب مناسبت نہ ہو۔ تو بیعت کا قلادہ ڈالنے کے باوجود۔ اور اوراد و ذکر کو ادا کرنے کے ساتھ بھی مرید ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔ کیونکہ جب تک مرید کی طبیعت انوار مرشد کے قبول کرنے کا مادۂ جذب نہ رکھتی ہو۔ انوار مرشد کی شعاعیں اندر سے اٹھتی ہی نہیں۔

علم اور چیز ہے اور فقر کی استعداد اور

آپ نے یہ نہیں دیکھا۔ کہ بعض صاحبِ علم بعض صاحبِ طریقت حضرات کی خدمت میں جاتے ہیں۔ اور ان کے فرمودہ کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے اندر ان کیفیات کو نہیں دیکھتے۔ جو ان کے دوسرے پیر بھائی اپنے سینہ کے اندر دیکھ کر بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کا علم کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ قرآن و حدیث کے

واقف اور عالم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ جس کو ظاہر کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ اس کو باطن کے ساتھ کم ہوتی ہے۔ اسی طرح جسے باطن کے ساتھ مناسبت زیادہ ہو۔ وہ ظاہر کے ساتھ کم تعلق رکھتا ہے۔

ظاہر و باطن کا امتزاج

انسان جسم و جان کا مرکب ہے۔ جسم بلا جان کچھ نہیں اور جان بلا جسم دکھائی نہیں دیتی! اور اس کے حرکات و افعال اور ارادہ و کیفیات نظر نہیں آتے۔ ایسے ہی علم ظاہر (شریعت) علم باطن (طریقت) کا لباس ہے۔ طریقت اس لباس کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک کہ یہ لباس جلوہ نمائی کے لئے طریقت کی جان پر نہ ہو اور بمنزلہ جسم دکھائی نہ دے۔

اور ایسے ہی علم شریعت۔ علم طریقت کے سوا بے جان ہو جائے گا۔ علوم شرعیہ کو کتنی بلندی پر اٹھایا جائے۔ اور اس کے اعمال پر کتنی سختی سے پابندی کیوں نہ کی جاوے لیکن جب تک علم باطنی کی روشنی اس کے جسم شریعت کے اندر روشن نہ ہو گی۔ تب تک اعمال و اذکار بے ذوق، بے نور نظر آئیں گے۔ اور دیکھنے والے پر کچھ اثر نہ ہو گا۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

ایسے ہی طریقت کے اصحاب جب اپنے جسم شریعت کے لباس سے خالی اور ننگے ہو جاتے ہیں۔ وہ برہنہ برہنہ نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھ حیا سے خالی

ہوجاتی ہے۔ اور اس لئے روشنی اپنے گلوب شیشہ عکاس کے نہ ہونے کی وجہ سے نہایت مدھم۔ بلکہ ہوا کے جھونکے ہر وقت اس کی لاٹ یعنی شعلے کو لرزاں کرتے رہتے ہیں۔ اور خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں یکدم کسی ایک جھونکے سے بجھ نہ جائے۔

شریعت جسم ہے اور طریقت جان

اس لئے جیسے جسم کے لئے جان۔ اور جان کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی شریعت کے لئے طریقت۔ اور طریقت کے لئے شریعت کا لباس اور جسم ضروری ہے لیکن علمائے ظاہر اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ شریعت سے آگے کچھ نہیں۔ سچ ہے کچھ نہیں لیکن شریعت کے اندر طریقت برابر دکھائی دیتی ہے۔ قرآن حکیم اور اُسوۂ حسنۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم برابر دونوں کی خبر دیتے ہیں۔ شریعت کو باجان کرنے کے لئے یہ روح ضروری ہے۔ یہ کوتاہ نظری ہے کہ اس کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔

ایک حقیقت

آپ موجودہ مفسّرین کی تفاسیر کا مطالعہ کیجیئے۔ جہاں ظاہری شریعت کے آیات محکمات آتے ہیں۔ وہاں صفحے کے صفحے آپ کو بھرے پڑے نظر آئینگے۔ لیکن جہاں طریقت کے آیات مُتشابہات آجاویں گے۔ وہاں متشابہات کہہ کر آگے خاموشی سے نکل جائیں گے۔ بلکہ متشابہات کا لفظ بھی ہیں نے بڑھا دیا۔ بس دم کھینچ کر قدم آہستہ اٹھاتے ہوئے پار نکلتے ہیں۔ کہ کہیں اس دلدل

طریقت میں پھنس نہ جائیں۔

صاحبِ علم کب صاحبِ حال بنتا ہے

ایسے حال میں انہیں طریقت کی ہوا نہ لگے۔ اور طریقت اُن کے ذہن میں نہ آئے تو کیا عجب! پھر دیکھا دیکھی جو جانتے بھی ہیں۔ وہ بھی اپنے علم کے زعم میں کچھ حاصل کرنے کے درپے نہیں ہوتے ہیں۔ بہت کم صاحبِ علم ایسے ہوتے ہیں۔ جو باطنی مناسبت سے تزکیہ کی دولت سے سرفراز ہونے کے بعد طریقت کے اندر چل نکلتے ہیں۔ یا بعض مرشد طاقتور اتنے ہوتے ہیں۔ کہ اپنی پہلی نظر سے علم کو کھا جاتے ہیں۔ اور ہستی کو نیستی میں بدل دیتے ہیں۔ اور پھر اپنے عکسی انوار سے طریقت کا حال ان پر وارد کر دیتے ہیں۔ اور وہ من و تو سے فارغ ہو کر جلالِ ربّ العزّت میں غرق ہو نکلتے ہیں۔ رومیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

علم را برتن زنی مارے بود　　　علم را بر دل زنی یارے بود

طریقت و شریعت کا فرق بس یہی ہے اگر شریعت کے اندر روشنی توحید و رسالت چمک اٹھے۔ تو یہ علم یار ہے۔ اور اگر قلب و نظر میں یہ روشنی پیدا نہ ہو۔ تو پھر یہ شرعی علم ایک سانپ ہوتا ہے۔ جو دل کو ڈستا رہتا ہے۔ جس سے نہ تو کسی کو فائدہ ہوتا ہے۔ اور نہ اپنے دل کو کوئی آرام پہنچتا ہے۔

ایک سوال

شاید آپ کو یہ خیال پیدا ہو جاوے۔ کہ پھر طریقت حاصل کرنا ہر صاحبِ شریعت کے لئے ضروری ہے؟ نہیں حاشا و کلّا۔ طریقت تو ایک وہبی نعمت

ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ اس میں کسی کو دخل نہیں۔ اور اس کے لئے کوئی مسلمان مکلف نہیں۔

طریقت کیوں ضروری ہے

ہاں! اس کی روشنی سے متاثر ہونا۔ اور اس کی روشنی سے روشنی حاصل کرنا ضروری ہے۔ یعنی ان کے انعکاس سے قلبی ہدایتوں کے اندر اثرات حاصل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ قلبی ہدایات اپنے پورے اثر سے جلوہ گر ہو کر شریعتِ الٰہیہ کو پورے طور پر قائم کریں۔ اور شریعت کے انوار روشن ہوں۔

جیسے تمام انسانوں کے لئے ایم۔ اے کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ کچھ نہ کچھ علم حاصل کرنا ضروری ہے جس سے اس قدر استعداد ہو جائے۔ کہ ایم۔ اے والوں کے علم سے فائدہ اٹھایا جاوے۔ خواہ کتنا ہی کم ہو۔

اس لطیف فن میں کامیاب کون ہو سکتا ہے

ایک صاحبِ طریقت لاکھوں انسانوں کے لئے کافی و شافی ہوتا ہے۔ اور وہ لاکھوں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔ جو تمام علائق کو پس پشت ڈال کر اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے جسم و جان کو قربان کر دے اور اپنے من دھن کو اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ط، کے مطابق فتنہ خیال کرے اور اس سے قلبی طور پر جدا ہو۔ اور صحیح معنوں میں فتنہ خیال کرے۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ کیا خوبی اور مزے سے فرماتے ہیں۔ ؎

مال و اولادت بمعنی دشمن اند   گرچہ نزدیک تو چشمِ روشن اند

اَللّٰھُمَّ اَمْوَالُکُمْ را یاد گیر — مال و ملک و دولت برباد گیر

ایسے لوگ صاحب طریقت ہی ہو سکتے ہیں۔ جو سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کر کے ننگ دھڑنگ ہو بیٹھتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ ننگے یعنی برہنہ ہوتے ہیں۔ بلکہ دنیاوی تعلق سے الگ دل کو صاف جلوہ ہائے الٰہی کے لئے تیار کئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور دل آگاہ رکھتے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے۔

فیض حق ناگاہ برسد لیکن بر دل آگاہ برسد۔[1]

ایک بے جان خطر

ہمارے علم دوست حضرات کو یہ کہتے سنا جاتا ہے۔ کہ اگر طریقت اور اس کے بعض افعال نامناسب پر ہم ایمان لائیں گے۔ تو شریعت خطرے میں پڑ جائیگی۔ اور حدود الٰہیہ کو توڑنے کا جواز خواص و عوام کو ہاتھ لگ جائے گا۔ اور یہ اتنا بڑا فتنہ ہے۔ جس کو کسی صورت پر نہ درست کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ بند کیا جا سکے گا اس لئے ہم اس فتنہ کی روک کے لئے اصل طریقت کو بے جان کر دیں۔ تاکہ یہ فتنہ پیدا نہ ہو۔

متنازع مسائل کی حقیقت

اس کی مثال بعینہٖ یہ ہے۔ اہل مقابر سے استمداد کو ناجائز قرار دینے والوں نے جب دیکھا۔ کہ لوگ اس سے باز نہیں آتے۔ تو انہوں نے شریعت غرا اور

---

[1] اللہ تعالیٰ کا فیض اچانک آتا ہے لیکن خبردار دل پر آتا ہے۔

علومِ اسلامیہ سے ایک اور قدم بڑھا کر صاف کہہ دیا۔ کہ وہ مٹی ہو چکے۔ وہ کچھ سنتے نہیں۔ جب سنتے ہی نہیں تو استمداد کیسی۔ یہ کتنی کمزوری ہے۔ کہ ایک امر متنازعہ فیہ کو رد کرنے کے لئے ایک حقیقتِ مسلمۂ اسلام سے انکار کر دیا جائے جبکہ احادیث اور قرآن حکیم اور اسوہ حسنہ پر کچھ بھی عبور ہے۔ وہ کیسے سماعِ موتٰی کا انکار کر سکتا ہے۔ ایک نہیں سینکڑوں احادیث اس کے لئے کتب احادیث میں موجود ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہ پہلے ادیان میں یہ مسئلہ برزخی زندگی اتنا واضح نہ تھا۔ جتنا اسلام نے واضح کرنے کی کوشش کر کے واضح فرما دیا۔

شریعت کے حدود واضح ہیں

اس کے علاوہ طریقت خواہ کتنی ہی قلابازیاں دکھائے۔ شریعت اپنے حدود اور اوامر میں اتنی واضح ہے۔ کہ کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ کہ ان حدود کو توڑنے میں طریقت کوشش کرے۔ جو طریقت کے امور مصالحت کے لئے کچھ ایسے دکھائی بھی دیتے ہیں۔ تو وہ انہی تک[1] محدود ہوتے ہیں۔ عام امت پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ طریقت کے ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے کوئی جواز کسی دوسرے کے لئے نہیں نکلتا۔

مجاذیب شریعت کا ادب کرتے ہیں

اہلِ جذب جو اصحابِ طریقت نہیں۔ بلکہ مجذوب کہلاتے ہیں۔ وہ کبھی منہ سے ایسے الفاظ نہیں نکالتے۔ جس سے شریعت کی تحقیر و تذلیل ہو۔ یا وہ کسی کو اس

---

[1] یعنی خود صاحب عمل تک۔

تذلیل شریعت پر اُبھاریں۔ یہ الگ ہے کہ ان کے حال سے کسی دوسرے پر بھی وہ حال وارد ہو جائے۔ اور وہ مرفوع القلم کے عکس سے اُسی کا نمونہ ہو بیٹھے۔ لیکن اس کی بھی کیا مجال، کہ ایک حرف وہ ایسے لغویات کا منہ سے نکالے۔

لباسِ فقر میں شریعت کی تذلیل کرنے والے بدمعاش ہیں

رہے وہ بدمعاش، جو لباسِ فقر میں شریعت کی تذلیل کرتے ہیں۔ ان کی طریقت کا پول دنیا کے سامنے ہوتا ہے۔ اور انہیں صاحبِ طریقت بھی پوری حقارت سے دیکھتا ہے۔ ے

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

کا مضمون دنیا کے افہام اور ذہنوں میں برابر گونجتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نفس امارہ کے بدخواہ اور متکبر ایسا کہہ دیں۔ مگر ہمیشہ ان کی تواضع جوتوں سے ہوتی چلی آئی اور ہوتی چلی جائے گی۔

الراسخون فی العلم کون ہیں

اس لئے اہلِ حق جن کو اللہ تعالے نے فہم سلیم دیا۔ اور جو اس کے آیات بیّنات پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ کبھی گھبراتے نہیں۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ

ے ہر وہ شخص جو سر منڈوا دیتا ہے قلندر نہیں بن سکتا۔ اور ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہو سکندر نہیں بن سکتا۔

يَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ ترجمہ:۔ اور علم میں پختہ لوگ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔ ہر چیز (معاملہ) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ دیکھئے کس فصاحت سے اللہ جلّ شانہٗ نے اس مطلب کو ہمارے سامنے واضح فرما دیا۔ کہ وہ ایسے متشابہات سے گھبراتے نہیں بلکہ ان پر ایمان لاتے ہیں اور کھلے الفاظ میں "اٰمَنَّا بِهٖ" (ہم اس پر ایمان لائے) کہدیتے ہیں۔ اور پھر فرماتے ہیں۔ یہ ایمان ہی ایمان نہیں ہوتا بلکہ اہل علم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نصیحت پکڑتے ہیں۔ تذکیر کیا لیتے ہیں؟ خود ہی فرماتے ہیں۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں التجا کرتے ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ ترجمہ:۔ اے اللہ ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد زنگ آلود نہ فرما۔ اور اپنی رحمت ہمیں بخش کیونکہ تو تو وہاب بخشنہار ہے۔

اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کا اختلاف مٹ سکتا ہے

ہاں یہ الگ بات ہے۔ کہ ہمارے اہلِ علم کو اتنی فرصت ہی کہاں جو ایسے آیات بیّنات پر توجہ فرمائیں۔ اور اس کے نتائج سے آگاہ ہوں۔ یہ سُنی سُنائی بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اپنا تدبر اور اپنی فکر قرآن پاک میں نہیں لڑاتے۔ ورنہ یہ جنگ و جدل اہلِ طریقت اور اہلِ شریعت کے ختم ہو جاتے۔ اور ایک "بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ" کی طرح باطل کا مقابلہ کرتے۔

فسخِ نسبت

معاہدین کی جب طبیعتیں بدل جاویں۔ تو معاہدہ ہمیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔
طریقت کا معاہدہ بہت نازک ہے۔ نکاح کے معاہدہ کو توڑنے کا حق صرف
مرد کو اسلام میں دیا گیا ہے۔ اور عیسائیت میں عورت کو اور ہندو مذہب میں
یہ معاہدہ کسی صورت میں ٹوٹتا نہیں لیکن معاہدۂ طریقت، مُرید کے عقیدے میں
جب تزلزل آجائے۔ اور اپنے مُرشدِ عالی کو کسی وجہ سے بھی ناقص یا کم اخلاق۔
یا کم نظر خیال کرے تو فوراً معاہدہ ہُوا ہو جاتا ہے۔ اور بعض وقت مرشدِ عالی
جب مرید کو دیکھتا ہے۔ کہ اسے مناسبت نہیں۔ یا اس کے احکامِ طریقت کو پورا
نہیں کر سکتا یا اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی عقیدت میں حُسنِ ظن نہیں رہا۔ تو وہ
خود اُسے الگ کر دیتا ہے۔ اور اُسے واگزار کر دیتا ہے۔ کہ جہاں اس کا نصیبہ
ہو۔ وہاں طریقت کے ثمر کھائے۔ یا اپنے لایعنی خیال میں سرگرداں رہے۔ گویا خود
بری الذمہ ہونا چاہتا ہے۔

جب نبھاؤ نہ ہو سکا تو نتیجہ ظاہر ہے

جیسے پہلے لکھا گیا ہے۔ موسیٰؑ بھی جب اپنا نبھاؤ نہ کر سکے۔ اور دیکھ چکے
کہ نبھاؤ مشکل ہے۔ تو خود ہی کہہ دیا تھا۔ اِنْ سَاَلْتُکَ عَنْ شَیْءٍ بَعْدَھَا
فَلَا تُصٰحِبْنِیْ۔ (اب اگر میں کچھ پوچھوں۔ تو پھر مجھے ساتھ نہ رکھنا)

دوسری طرف خضرؑ بھی دیکھ چکے تھے تشریع و تکوین کا مساویانہ امتزاج مشکل ہے۔ میں کچھ اور دیکھتا ہوں اور وہ کچھ اور سمجھتے ہیں اس لئے آخری مرتبہ فرما دیا "هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ" غرض معاہدہ بیعت ختم ہو گیا۔ اور اپنی راہ چلنے لگے۔

بدعقیدہ مرید کا انجام

طریقت میں اکثر ایسے ہی چلا آتا ہے۔ کہ جب مرید بدعقیدہ ہو گیا تو خود بیٹھ گیا۔ اور حاضری پیر سے رہ گیا۔ اور اگر پیر مرشد نے کمی دیکھی تو خود جواب دیدیا۔

تربیت کامل سے غیر اللہ کی محبت دل سے نکل جائے

حضرت للّٰہی[1] رحمۃ اللہ کے مخلص جو وضو وغیرہ کرانے کی خدمت میں اپنے اخلاص کی وجہ سے آفتابہ بردار تھے۔ ایک بار کسی مخلص دوست سے ذکر کیا۔ کہ میرا اگر فلاں سے نکاح ہو جائے۔ تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس مخلص نے موقع پا کر حضرت کی خدمت میں عرض کر دی۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں! وہ ایسے چاہتا ہے۔ عرض کی آپ کی مہربانی! آپ خاموش ہو گئے لیکن جب وہ سحری کے وقت وضو کرانے کے لئے خدمت میں حاضر ہوا۔ تو حضرت نے پوچھا۔ کیوں بیاں نکاح چاہتے ہو؟ جواباً کہا نہیں۔ پھر دوسری رات ایسے ہی دریافت کیا۔ غرض اس وقت تک پوچھتے رہے جب تک کھلا اس نے اقرار نہ کیا۔ پھر فرمایا کس سے۔ پہلے تو ایسے گول رکھا لیکن

---

[1] حضرت اعلیٰ غلام نبی للّٰہی۔ جو حضرت غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ اور للہ شریف ضلع جہلم میں مقیم تھے۔

آپ کے اصرار سے بتلا دیا۔ آپ نے کچھ ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ متانت طبعی بدستور رہی لیکن صبح نماز کے بعد حلقہ ارادت سے فارغ ہوئے۔ تو سارا مجمع مخلصین حاضر تھا فرمایا دو اچھے مضبوط آدمی باہر آجاویں۔ چنانچہ حکم پاتے ہی دو مضبوط خادم سامنے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں کے کان پکڑ لو۔ اور اللہ کی حدود سے باہر چھوڑ آؤ۔ جب وہ لے چلے۔ تو بعد میں مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کبھی بھی کوئی شخص اس کی سفارش مجھ سے نہ کرے۔ خیر وقت گیا اور گیا۔ تقریباً آٹھ سال گذر گئے۔ آپ جانتے ہیں۔ جب کوئی سالک کسی درگاہ ارادت سے دھتکارا جاتا ہے۔ تو اس کا خستہ حال کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آخر کسی پرانے دوست کو رحم آیا۔ اور اس نے بارگاہ عقیدت میں عرض گذاری کہ اب تو اس پر رحم فرمایا جاوے۔ اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے۔ کہ دیکھی نہیں جاتی۔ آپ نے فوراً فرمایا۔ کہ کوئی اس کی سفارش نہ کرے۔

جب استعداد ہی نہ ہو تو پیر کیا کرے

پھر فرمایا مجھے اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی اس نے میری بڑی خدمت کی تھی لیکن جب میں نے دیکھا۔ کہ آٹھ سال کے اندر اس کے دل سے عورت کی محبت میں نکال نہیں سکا۔ تو اب میں نے سوچا۔ کہ میں کیوں اس کا وقت ضائع اس کام میں کروں۔ یہ جس چیز کا اہل ہے۔ اس کام کو جا کر سنبھالے۔ غرض مرشد حق کسی کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اور نا اہل کو خانقاہ سے نکال دیتا ہے۔

قصہ حضرت موسیٰ و خضر کی آیات اور ان کی تشریح و توضیح آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور وہ حقیقت طریقت جو پیش کی گئی ہے امید ہے کہ آپ کے ذہن میں آ چکی ہوگی اور طریقت و شریعت کے اس امتیاز میں ہونگے کہ طریقت شریعت کی جان ہے لیکن جیسے ایک انسان کا جسم اور روح الگ الگ زیر بحث آتے ہیں اسی طرح شریعت و طریقت الگ الگ زیر نظر آتی ہیں اور دونوں کے مسائل بھی الگ الگ ہیں اور الگ توضیحات اور الگ الگ استعداد

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے طبائع اور استعداد ملاحظہ کر چکے نبوت اور ولایت کی دونوں شانیں دیکھ چکے تشریع ابتدا ہے اور تکوین انتہا ہے۔ دوسری طرف تکوین روح ہے اور تشریع جسم۔ جسم ہر ایک کو نظر آتا ہے لیکن روح کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں اگر ہے بھی تو آثار اور نشانات سے۔

مذہب کی بنیاد حقیقی طریقت پر ہے اور ثمرہ شریعت ہے اور اس ثمرۂ شریعت کے لئے تخم طریقت ہونا ضروری ہے جب تک یہ تخم پوری قوت کے ساتھ دل میں نہ ہو شجرۂ شریعت اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا پہلے ہے اور اس کے بعد اس کے احکام شریعت پر چلنا ہے ذات جب تک مشاہدہ میں نہ آئے ایمان کیسے قائم ہو اس نکتہ کو اور واضح کرنے کے لئے چند آیات قرانی آپ کی تشفی کے لئے پیش کرتا ہوں مثلاً :۔

(۱) واللہ الغنیّ وانتم الفقراء

جب تک یہ حقیقت ثابتہ کسی کے سامنے نہ آئے کیسے وہ اللہ کو غنی خیال کر سکتا ہے اور فقر اپنے لئے کیسے خیال کر سکتا ہے۔ یعنی غنا اللہ کے لئے اور فقر اپنے لئے

(۲) وللہ یسجد من فی السمٰوٰت والارض

یہ کیسے شریعت سے کھل سکتا ہے کہ تمام زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہے ایسے ہی "یسبح للہ مافی السمٰوٰت والارض" جب تک اپنے کانوں سے کوئی ان کی تسبیح نہ سنے کیسے تسلیم کر سکتا ہے کہ ہر چیز مولیٰ کریم کی تسبیحات پڑھ رہی ہے علیٰ ہذا القیاس مندرجہ ذیل آیات قرانی اور ان کے مطالب صرف "یعلمھم الکتاب" سے بغیر "یزکیھم" کے کیسے ذہن نشین ہو کر ایقان کے درجہ پر پہنچ سکتے ہیں "یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب"

یزکیھم مقدم ہے اور یعلمھم بعد میں

(۱) واللہ علیٰ کل شیءٍ شہیدٌ ○

(۲) واللہ بکل شیءٍ محیطٌ ○

(۳) واللہ علیٰ کلّ شیٍٔ قدیر

(۴) نحن اقرب الیہ من حبل الورید

(۵) واللہ بکلّ شیٍٔ علیم

(۶) واللہ بکلّ شیٍٔ بصیر

یہ بنیادی عقیدے توحید کے ہیں جب تک ان پر کامل ایمان نہ آئے توحید کا تخم پروان نہیں چڑھتا اسی لئے نبوت کی نیابت کے لئے ولایت کی استعداد قائم فرمائی گئی تاکہ ہر دور میں نبوت کا مشاہدہ تقویت پاتا رہے اور تقلید کو مشاہدہ کی روشنی پہنچتی رہے اور صاحب تقلید مشاہدہ کی روشنی سے نور کامل یقین میں رہے

یہ نبوت کی استعداد ہے اور نبوت کی استعداد کا جب کامل پر تو اور عکس کسی صاحبِ استعداد پر پڑتا ہے تو یہ عکس وہ تمام کچھ سامنے کر دیتا ہے جو سرِ امر حقیقت ہوتی ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے

اللھم ارنا حقائق الاشیاء کما ھی

اب یہ 'کما ھی' اس چیز کی حقیقت دیکھنے اور سامنے آنے کا نام طریقت ہے اور یہ استعداد ہی حقیقتاً فطرۃ اللہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد ہے ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ

یہ آیتہ مبارکہ بھی ہمارے مقصود و مطلوب کو واضح کرنے کے لئے کافی وشافی ہے

استعداد علمی اور چیز اور استعداد روحانی اور دولت ہے اگر استعداد روحانی نہ ہو تو یہ ضروری نہیں کہ استعداد روحانی کا انکار کر دیا جائے کتاب کا یہ حصہ اب ختم کیا جاتا ہے جو گزشتہ مرشد کے ذریعہ کا نمونہ تھا اور دوسرا حصہ بلا مرشد جو رشد دلایا جاتا ہے اس کو اسی سورہ کہف قصہ اصحاب کہف سے پیش کیا جاتا ہے اگر آپ مکرر سہ کرر میری تحریر پڑھیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ تمام مطالب سامنے آجائیں گے جن کو آپ دیکھنا چاہتے ہیں ؕ

طریقت کی حقیقت

قرآنی آیات میں

حصّہ دوئم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَیَسِّرۡلِیۡ اَمۡرِیۡ

وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَھُوۡا قَوۡلِیۡ

پہلے حصۂ طریقت میں لکھا گیا ہے۔ کہ قصۂ خضرؑ و موسٰےؑ۔ قصۂ اصحاب کہف اور قصۂ ذوالقرنین میں یہ مشابہت ہے۔ کہ یہ پاک نفوس نبی تو نہ تھے لیکن اللہ تعالٰے کے نہایت نیک بندوں سے ہو گذرے۔ جن کی زندگیاں ہمارے لئے مشعلِ ہدایت بن گئی ہیں۔ اور قرآنِ حکیم مثالی طور پر ان کو بیان کر کے ان کے علم و رُشد سے ہدایت کے سبق سکھلاتا ہے۔ یہ تمام قصّے سورۂ کہف کے اندر جمع کر دئے گئے۔ اور کسی نبی کا اصالتاً ذکر نہیں کیا گیا۔ مثلاً حضرت موسٰے علیہ السلام کا ذکر تبعاً آ گیا ہے۔

قرآنِ حکیم جہاں قوانینِ فطرت اور احکامِ شریعت پیش کرتا ہے۔ وہاں ساتھ

ساتھ "تبشیر اور انذار" (خوشخبری اور خوف) سے عمل پر لانے کا طریقہ بھی جاری رکھتا ہے۔ تاکہ فطرتِ سلیمہ کے اندر اُس کے احکام کی تعمیل کا جذبہ پیدا ہو۔ اور اس کے مناہی سے بچنے کے لئے دلی طور پر تیار ہو جائے۔

سورۂ کہف کی ابتدائی آیتوں کو پڑھیئے۔ تاکہ واضح ہو جائے۔ کہ ان قصص کی غرض و غایت کیا ہے۔ اور مقصود کیا؟ فرماتے ہیں:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝	اللہ کی تعریف ہے۔ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری۔ اور اس کے اندر کوئی کجی نہ رکھی۔ نہایت ٹھیک تاکہ ڈرائے ایک سخت مصیبت اور آنیوالی آفت سے۔ اور خوشخبری دے یقین (لانے رکھنے) والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں۔ ان کے لئے نہایت اچھا اجر (معاوضہ) ہے جس کے اندر ہمیشہ رہیں گے۔ اور ڈرسنائے ان کو جو یہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ نے صاحبزادہ بنالیا۔

چونکہ ہمارا تعلق حصۂ تبشیر (یعنی بشارت والوں) کے ساتھ تھا۔ اس لئے دوسرے حصہ کو چھوڑ کر ہم اپنے متعلقہ قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور دوسرے حصہ (انذار) کو چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود وہی ہے۔ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ یعنے ایسے بُرے عقیدہ کی بیخ کنی کرنی۔ جو عقلاً نقلاً کسی طرح بھی ممکن الوقوع نہیں کہ خالق و مخلوق کے تعلق کے باوجود والد و مولود کا تعلق ہو سکے۔ جس کی وعید

کے لئے بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ کی وعید سخت سُنائی گئی۔ اس کے لئے دیکھئے افادات گیلانی (مطبوعہ الفرقان لکھنؤ) تاکہ اس وعید کی حقیقت آپ پر روشن ہو۔ کہ یہ تکمیل ہو رہی ہے۔

رُشد

رُشد کے عنایت کرنے کے دو طریقے اللہ تعالےٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ایک تو بالواسطہ۔ جیسے پہلے قصۂ خضرؑ و موسےٰؑ میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ خضر کو رُشد بلاواسطہ حاصل تھا۔ لیکن اس کے حاصل ہونے کا طریقہ وہاں نہیں دیا گیا۔ اور وہ ہے مِنْ لَّدُنْہُ " اس کی ذات سے بلاواسطہ" قصّہ اصحابِ کہف میں اسی عنایت کا مفصل ذکر آیا ہے۔ کہ کیسے اُن کو اعلیٰ درجہ کے رُشد پر پہنچایا گیا۔ یہ ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس پر جتنا غور کیا جائے اتنے رموز و کنایات ہیں۔ بلکہ واضح صورت سامنے آجائے گی۔ گذشتہ اور قدیم مفسّرین نے صرف اس سے ایک معجزہ دکھانے کا کام لیا ہے لیکن حقیقتاً معجزہ سے بڑھ کر ایک سبق طریقت ہے۔ جو اہلِ اسلام کو دیا گیا ہے۔ کہ ایک ایماندار اپنا ایمان کہاں تک بلند کر سکتا ہے۔ اور کس درجہ پر اپنے یقین کو لیجایا جاتا ہے۔ اور کس طرح کے فضل اور اکرام ایسے ایمان اور رُشد پر عنایت ہوتے ہیں جن کے لئے یہ الفاظ "اَجْرًا حَسَنًا" "مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا" فرمائے گئے۔ یہ الفاظ کوئی معمولی قیمت نہیں رکھتے۔ بلکہ ایسے گراں بہا معاوضہ کی خبر دیتے ہیں۔ جو اہلِ دنیا کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتے۔ خواہ دنیا کے خزانوں کا مالک ہی کیوں نہ ہو خزانے

کب تک چلتے ہیں ؟۔ چند سال نہیں تو چند صدیاں سہی اِس سے آگے اُن کا قدم نہیں نکلتا لیکن یہ معاوضہ۔ اس دنیا سے نکل کر اگلی دنیا کے اندر اس سے بھی بڑھ کر سرسبز و شاداب ہوں گے۔ دنیا میں دیکھتے نہیں یہ کب کا واقعہ ہے۔ اور اس وقت سے لیکر آج کی دنیا تک برابر ان کو زندگی ملی ہوئی ہے۔ اور اتنے طویل عرصہ میں اپنے ذکر کی روشنی دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔ اور اس روشنی کو ایک روشنی کے مینار کی حیثیت کتبِ سماویہ سے حاصل ہو گئی۔ اور قیامت تک یہ مینار اپنی روشنی دیتا رہے گا۔ اور ہر آنے والی نسل اس سے سبق حاصل کرے گی۔ اور نورِ ہدایت پائے گی۔ اور قربِ مولیٰ کے لئے یہ مینارِ ہدایت ایک سیڑھی کا کام دے گا۔ اور پاک فطرتیں لذتِ قُرب حاصل کریں گی۔ اور دینِ فطرت کے لئے ایک مثالی نمونہ بنیں گی۔ جیسے اصحابِ کہف آج مثالی طور پر سامنے کئے گئے ہیں۔ کل آنکھوں کے سامنے وہ زندہ مثالیں اور مشعلیں روشن امت محمدیہ کے سامنے ہوں گی۔ جن کا اجر، معاوضہ سے ان کو بھی ملے گا۔ جن کے نقشِ قدم پر چل کر ہم دنیا میں سُرخرو ہوں گے۔

اصحابِ کہف کی مختصر کہانی

عیسوی ظہور کے بعد دقیانوس بادشاہ بت پرست تھا۔ شہر انسوس میں چند نوجوان جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید سے حصہ بخشا تھا۔ اُس کے خوف سے۔ کہ کہیں ہمیں بُت پجاری بنا کر ہمارے ایمان ضائع نہ کردے۔ چُپکے سے شہر سے نکل گئے اور اپنے ایمان کے بچاؤ کی خاطر ایک کہف (کھوہ) کے اندر جا پہنچے۔ جہاں اللہ تعالٰی کی قدرت سے وہ سو گئے۔ اور جب جاگے۔ اور بھوک محسوس

ہوئی۔ اور اپنے ایک ساتھی کو کھانا لانے کے لئے بھیجا۔ تو بازار میں اس سکہ کو دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ کیونکہ دقیانوس کے زمانے کو کئی صدیاں گذر چکی تھیں۔ جب زیادہ پوچھ گچھ اس سکہ لانے والے سے کی گئی۔ تو آپ نے دقیانوس کا زمانہ بتلایا۔ لوگ اس پر حیران ہو گئے۔ اور بادشاہِ وقت جو اس وقت دینِ عیسوی قبول کر چکا تھا۔ اور موحّد تھا اس کے سامنے لے گئے۔ اس نے جب اپنا قصہ سنایا۔ تو لوگوں کو اُس کہف اور ان آدمیوں کا قصہ جو پہلے لوگوں سے سنتے آئے تھے۔ یاد آیا۔ اور حیران ہو کر رہ گئے۔ خود اصحابِ کہف کو بھی پتہ نہ تھا۔ کہ کتنا وقت گذر گیا ہے۔ بلکہ ان کے خیال میں ایک دن یا دن کے کچھ حصے کا خیال ہی تھا۔ قرنوں اور زمانوں کا خیال تو کجا۔ وہ خود اور باقی تمام دنیا اللہ تعالےٰ کی اس حکمت اور معجزہ سے حیران رہ گئی۔ اور اللہ تعالےٰ کے ایجاد و ابعاث (پیدا کرنا اور نئے سر سے چلانا) کی قدرت کو پا گئے۔ اور وہ ایمان لانے والے ہو گئے۔ پھر اس جگہ پر نشان قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اور بعض وہ ایماندار جو اُن سے ایمانداری نسبت سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی رائے پر غالب آ گئے۔ اور مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ ایک مدت تک نشان باقی رہا۔ اب بھی بعض کا خیال ہے۔ کہ وہ سوتے ہیں۔ اور جب تک دنیا قائم ہے۔ سوتے رہیں گے۔ اور ان کے پانسے (جانب جسمی) فرشتے چھ ماہ کے بعد الٹ دیتے ہیں۔ تاکہ جسم گل اور سڑ نہ جائے۔

اب یہ قصہ اور کہانی ذہن نشین کرنے کے بعد قرآن حکیم کی آیات کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ کہانی قرآنِ حکیم سے اخذ کی گئی ہے لیکن بعض الفاظ کا صحیح مفہوم نہ متعین ہونے کی وجہ سے مفسرینِ قرآن کچھ ایسی روش پر چلے ہیں۔ کہ بجائے

کہانی کھلنے کے ایک معمّہ یا چیستان یہ کہانی ہوگئی ہے۔ چنانچہ موجودہ مفسّرین تو ایک عجب پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور ایسی بوکھلاہٹ سے دوچار ہوئے کہ قرآنِ حکیم کا اصل مقصد جو رُشد وارشاد تھا۔ وہ گم ہوگیا۔ اور وہمات میں اُلجھ کر رہ گئے۔ میں خود بھی ان کو پڑھ کر بعض وقت حیران ہُوا۔ اصل وجہ وہی تھی۔ کہ ان کو رُوحی تعلق باللہ نہ تھا۔ وہ عقلی ڈھکوسلوں کے پیچھے اندھا دُھند چلتے تھے لیکن تاہم دُنیا میں۔ اہلِ اتّقا موجود ہیں۔ جن کی بصیرت افزا تحریریں بعض وقت نازک سے نازک مسئلے پر پوری ہدایت کا کام کرتی ہیں۔ اگرچہ ان تحریرات کے پڑھنے کے بعد پوری حقیقت واضح نہ ہوئی۔ لیکن تدبّر کی راہ نے بہت کچھ حصہ کے مطالب روشن کر دیئے ہیں۔ جو سراسر اربابِ طریقت کے لئے موزوں نظر آئے۔ اور بلا ریب یہ وہ کچھ ہیں۔ جو علمائے ظواہر کے سوچنے کے لئے ایک اہم ترین حقیقت روشن کریں گے۔

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا — کیا تُو خیال رکھتا ہے۔ غار اور کھوہ والے ہماری قدرتوں میں اچنبا تھے۔

ایک دوسرا ترجمہ: کیا تم سوچتے ہو۔ کہ اصحابِ کہف اور رقیم کے ہماری نشانیوں میں کوئی اچنبے کی بات ہے؟۔

الکھف والرّقیم | اکثر نظریات کا اختلاف الکہف اور الرّقیم کے واضح معنے سامنے نہ آنے کی وجہ سے ہُوا۔ اور الکھف کا ترجمہ غار کر لیا گیا۔ حالانکہ غار کچھ اور ہے۔ کہف کچھ اور۔ غار پہاڑ کے اندر

ہوتی ہے۔ اور ایک دروازہ ہوتا ہے۔ اور باقی طرف سے بند ایک سوراخ کی شکل ہیں۔ بخلاف کہف کے۔ یہ پہاڑوں کی دیواروں میں گھری ہوئی ضرور ہوتی ہے لیکن چھت بند نہیں ہوتی۔ بلکہ آسمان نظر آتا ہے۔ اور اکثر ایک طرف سے کھلا راہ رکھتی ہے۔ خواہ کتنا تکلیف دہ بھی ہو۔ یعنے وہ بھی سطح زمین سے بہت بلند۔ یا برابر۔ گاہ اندر سے بہت لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ اور اکثر لمبی تو ہوتی ہے۔ لیکن چوڑائی میں کم۔ اصحابِ کہف کی۔ الکھف معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ لمبی تو بہت زیادہ تھی لیکن چوڑی کم تھی۔ جس کا فیصلہ خود قرآن حکیم آگے جاکر دیتا ہے۔ پنجابی زبان میں چھپڑی اور اردو زبان میں کھوہ اُسے کہتے ہیں۔

الرّقیم المرقوم "لکھا ہوا" کے معنے ہیں بعض نے تو اس سے کتبہ مراد لیا ہے۔ جو کہتے ہیں۔ کہ اصحابِ کہف کے اندر داخل ہونے کے بعد شاہِ وقت نے لگوا دیا۔ تاکہ ایک نشان قائم ہو جائے۔ اور بعض نے الرقیم سے "کتاب پیغمبرِ وقت" مراد لی ہے۔ اور یہ ہیں ہمارے بزرگ مناظر احسن گیلانی مرحوم بہرصورت الکھف کے معنے نہ واضح ہونے کی وجہ سے بعض بڑے بڑے مُفسر مُغالطہ میں رہ گئے۔ اور پھر بہت من گھڑت باتوں سے خیال کو پورا کرنا پڑا۔ ہم انشاء اللہ اپنی طرف سے کچھ کہنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ خواہ کوئی مطلب یا کہانی واضح ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں تو قرآن حکیم سے اس کی بصیرت و ہدایت سے سبق لینا ہے۔ اور بس۔

كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ایک معنے تو یہ ہیں۔ کہ تُو اے مخاطب ہماری بڑی نشانیوں سے یہ نشانی خیال کریگا لیکن ہمارے پاس اس سے بہت بڑھ کر پیدائش و

خلق کے نمونے موجود ہیں جس کے سامنے یہ ہیچ ہے ۔

دوسرے :- ایک گندے اور مشرکانہ ماحول سے چند آدمیوں کا اس طرح نکل آنا ۔ کہ گھر بار چھوڑ کر راہِ مولیٰ میں چل دیتے ہیں ۔ اور کوئی سہارا نہیں لیتے ۔ اور صرف ذاتِ اقدس کے سہارے دنیا کو ترک کر دیتے ہیں ۔ اور خالی دعا پر ہاتھ اٹھائے نظر آتے ہیں ۔ اور اس کے سوا کچھ سہارا نہیں رکھتے جس کی تفصیل خود بارگاہِ قبولیت بایں الفاظ فرماتی ہے :-

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

جب جا بیٹھے وہ جوان اپنی کھوہ میں پھر دعا کرنے لگے اے ہمارے رب ہمیں اپنی رحمت خاصہ سے نواز ۔ اور ہمارے معاملہ کو درست فرما ۔

دُعا کے جُملے ۔ دُعا کے اندر دو فقرے یا دو جملے ہیں ۔ لیکن کیا غضب کے ۔ ساری دُنیا کی عنایات ۔ نصرتیں اور شفقتیں اس کی لپیٹ میں آجاتی ہیں ۔

رحمت ۔ یوں تو مولائے کریم کی رحمت ہر آن اور ہر گھڑی اس کی تمام مخلوق پر برس رہی ہے لیکن جب یہ لوگ دنیا سے کٹ آئے ۔ اور تمام وسائلِ دنیا کو ترک کر کے آئے ۔ تو اب یہ صرف رحمتِ خاصہ کے طلبگار ہیں ۔ کہ اس کی رحمت کے سہارے زندگی بسر ہو جائے گی ۔ اور دنیاوی اسبابِ معیشت پر تنگی نہ آئے ۔

أَمْرِنَا رَشَدًا دوسرا لفظ رشد ۔ امرنا کے ساتھ لگا کر وہ کچھ طلب کر لیا ۔ جو دنیا اور مابعد دنیا کے لئے ضروری تھا ۔ یعنے اپنے عمل کا سدھاؤ ۔ یعنی ٹھیک ٹھاک ۔ ہمیشہ کے لئے اور آئندہ کے لئے ۔ اور سدھاؤ کون کرے ؟ ۔

ربِّ غفور۔ ہر کا داتا۔

دیکھئے دُعا کتنی جامع ہے۔ لیکن عنایت کیا ہُوا اور قبولیت کے الفاظ کیا ہیں۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا

پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان اس کھوہ میں۔ گنتی کے کئی برس پھر (اس کے بعد) ہم نے ان کو اٹھایا۔ کہ معلوم کریں دونوں فریقوں میں کس نے یاد رکھی مدت رہنے کی۔

یعنے کانوں سے بہرے کر دیئے گئے۔ اور وہ بھی ایک لمبی مدت تک جس کی یاد بھی لوگوں سے اُٹھ گئی۔ مولائے کریم حکیم۔ خبیر۔ علیم ہیں۔ ظاہراً تو بہرا ہونا کچھ اچھی بات نہیں لیکن غور کریں۔ تو اس راہ کے لئے جس پر وہ چلے۔ یعنے اللہ تعالٰے کے ملنے کی راہ۔ اور معرفتِ الٰہیہ کا راستہ۔ اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے تھا۔

گوش بندی جب کان بند ہو جاتے ہیں۔ تو خود بخود بولنا کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مخاطب خطاب کے بعد تکلم میں آتا ہے۔ اور متکلم بنتا ہے۔ لیکن جب کچھ سُنے ہی نہیں۔ تو خاموش ہو جاتا ہے۔ اور خاموشی دل کی بصارت اور روشنی کو تیز کرتی جاتی ہے اور دل کے اندر فیوضاتِ الٰہیہ جوش کھانے لگتے ہیں۔ وہ دولت جو سالوں میں حاصل نہیں ہوتی۔ وہ گھنٹوں میں میسر ہو جاتی ہے۔ اور مولائے کریم کے ساتھ تناجی (سرگوشی) اور بات چیت بڑھ کر۔ ہر قسم کے یقین اور تسلی کا باعث

ہوتی ہے۔ اور تسلی ویقین ہی وہ دولت ہے۔ کہ جب آجاوے۔ تو ہر قسم کی پریشانیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور تمام سامانِ معیشت سے نظر اُٹھ جاتی ہے۔ توکل کا دروازہ ایسا کھُلتا ہے۔ کہ غیبی رزق آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کان کیا بند ہوئے۔ ہر طرح اطمینان و آرام کی دولت گویا مہیا کر دی گئی۔ اور وہ لوگ با اطمینان زندگی پوری کرنے لگے۔

گِنتی کی یاد یہاں تک کہ کسی کو پتہ تک نہ رہا۔ کہ کتنے سال و ماہ گذر گئے۔ اُن کو خود یعنے اصحابِ کہف کو۔ یا ان کو اور باہر والوں کو۔ یعنے باہر کی دنیا کو کہ کتنا عرصہ گذر گیا ہے۔ غرض ایک طویل مدت گذر جانے کی وجہ سے ایسا فرمایا گیا۔ کہ جب آرام ملتا ہے۔ تو گنتی کے ایام کم معلوم ہوتے ہیں۔ اور لمبا عرصہ بھی کم خیال میں آتا ہے۔ یہی حال یہاں اصحابِ کہف کا ہُوا۔ کہ کسی ایک کو اس مدتِ طویل کا خیال تک نہ آیا۔ دن رات گذرتے گئے۔ اور یہ لوگ اپنی لگن "یادِ الٰہی" میں مست تھے۔ نہ اپنا خیال تھا۔ نہ غیر کا۔ نہ اپنی پہلی زندگی کا وقت ذہن میں رہا۔ نہ موجودہ زندگی کہفی کا احساس کچھ تکلیف دہ تھا۔ غرض ایک بہشت کی زندگی ہو گئی تھی۔ جس کے اندر سال و ماہ کا شمار نہیں۔ اور یہ کیوں۔ صرف یادِ الٰہی اور اسرارِ الٰہیہ کی مدہوشی میں۔ اور مستی میں وقت گذر گیا۔

قصہ کے اجمال اور اختصار کی وجہ

مخاطب کو جب "كَانُوا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا" کی آواز کان میں پہنچتی ہے۔ تو مخاطب کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ اور قصہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتا ہے۔

رنی کریم جو فطرتِ انسانی کا خود خالق ہے۔ جانتا ہے۔ کہ تشویق کو کیسے اُبھارا
دیے۔ تو ایک مختصر سا بیان فرما دیا۔ جو صرف دو آیات پر مشتمل ہے۔ دُعا
ور جوابِ دُعا۔ جس سے مخاطب اس کی تفصیل پر ابھرتا ہے۔ اور تفصیل کے لئے
یاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قصۂ اصحابِ کہف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب
خاطب ہمہ تن گوش ہو کر رہ جائے گا۔ اور تفصیل سامنے آنے پر اُس کی حیرت اور
تعجب کی کوئی انتہا نہ رہ جائے گی۔ چنانچہ اس اجمال کے بعد تفصیل کی طرف قدم
اٹھاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

خانقاہیّت

علم والے خانقاہیّت کے نام سے گھبراتے ہیں۔ اور اہلِ علم خانقاہی
زندگی کی بابت جس تحقیر و تذلیل کا رویہ رکھتے ہیں۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔
بلکہ بار بار فرماتے ہیں۔ یہ اسلام پسند نہیں کرتا۔ یہ رہبانیّت ہے۔ جسے دُور
کا تعلق بھی اسلام سے نہیں۔ دنیا اور دنیا کے نظام میں جو نہیں۔ اس نے اسلام کو
سمجھا ہی نہیں۔ لیکن معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیوں ایسی آیات پر غور نہیں کرتے۔
جن میں خانقاہی زندگی کو صرف پسند ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا
عَجَبًا ۵ ان خانقاہی زندگی والوں کے لئے فرمایا گیا۔ کیا خانقاہی زندگی اس کے
سوا کچھ اور ہوتی ہے؟ کیا یہی بعینہٖ نقشہ نہیں ہوتا۔ کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے کٹ
کر ایک الگ گوشہ میں بیٹھے یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نہ تن کا فکر ہے۔ نہ
کھانے پینے کا خیال۔ لباس و رہائش پہلے ہی ختم کر کے نکلتے ہیں! ور اسی ایک

کے ہو کر گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ پھر وہی ضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ کے مطابق کسی سے کچھ سننا پسند نہیں کرتے۔ اور اپنے خیال میں مست گنگناتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی شان۔ کہ ان کے کھانے پینے کے سامان خود بخود "حسب منشاء قدرت" مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ عمریں گذرتی ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اپنی دنیا بسائے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

پہلے قصہ کے اجمال اور بعد کی تفصیل کی وجہ

جب کسی مخاطب کو کسی عجیب امر یا قصہ کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ تو پہلے متکلم اس کے عجوبہ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ تاکہ مخاطب پوری توجہ دے۔ اور اس کے بعد ایک مجمل سا خاکہ پیش کر کے مخاطب کی طبیعت کو ابھارتا ہے۔ تاکہ اس کی تفصیل کے لئے اس کا اشتیاق دگنا تگنا ہو جاوے۔ بعینہٖ یہی حال ہمارے اس قصہ کا ہے۔ پہلے مولائے کریم نے كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ فرما کر مخاطب کو اس قصہ کی طرف متوجہ کیا۔ پھر ایک اجمالی خاکہ سنا کر مخاطب کو پورے اشتیاق سے متوجہ ہونے پر ابھارا۔ چنانچہ اجمالی آیات کے بعد اب تفصیلی آیات شروع ہوتے ہیں۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا	ہم ان کا حال ٹھیک سناتے ہیں۔ وہ کئی جوان یقین اپنے رب پر لائے۔ اور ہم نے اور ہدایت ان پر بڑھادی۔ اور ان کے دلوں کو خوب جوڑ

فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝

دیا (باندھ دیا) اور مضبوط کر دیا جبکہ وہ کھڑے ہوئے اور پکار اُٹھے۔ کہ ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی کو خدا نہ پکارینگے اگر ہم ایسا کہیں گے۔ تو عقل سے دُور کی بات کہیں گے۔

تشریح اس ملک کی آبادی تمام کافر تھی۔ اور یہ چند جوان محض فضلِ الٰہی سے موحّد ہو بیٹھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ اندر سے فطرت نے اُنہیں توحید پر مجبور کیا۔ یا کسی واسطہ سے ہوئے۔ بعض اقوال میں ہے۔ کہ دینِ عیسوی کے ابتدائی ایّام تھے۔ اور کسی طرح دینِ عیسوی کی دعوت اُن تک پہنچ گئی۔ اور وہ ایمان لے آئے لیکن اس صورت میں جب ایمان لائے۔ تو مولیٰ کریم کی خاص مہربانیوں کے مَورد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایتِ خاصہ سے سرفراز فرمایا۔ وہ ہدایتِ خاصہ کیا ہے؟۔ وہ ہے شرحِ صدر۔ اور نُورِ قلب۔ جس پر براہِ راست فیوضاتِ رحمانی وارد ہوتے ہیں۔ غرض ایک ایمان تو پہلے تھا۔ لیکن اس ایمان کے ساتھ ایک اور ہدایت شامل ہو گئی۔ اور وہ ایمان پورے یقین کے درجہ پر پہنچ گیا۔

ایمان بڑھتا ہے

شریعتِ غرّا پر ایمان لانے کے بعد جب کوئی سلوک میں قدم رکھتا ہے۔ تو اسی طرح ایمان ترقی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ یقین کے آخری درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ بعض اہلِ علم طریقت اور راہِ سلوک کو بے فائدہ خیال کرتے ہیں۔ وہ خود

اس جملہ پر خیال فرماویں - ایمان کے بعد یہ کیا درجہ آگیا - جس کے لئے یہ جملہ مولائے کریم کو بڑھانے کی ضرورت آئی - وَزِدْنٰهُمْ هُدًى - سبحان اللہ مولیٰ کریم کی جس پر یہ مہربانی بلا واسطہ ہو - وہ کتنی مہربانی ہے - اور وہ کتنی ہدایت ہوگی - جو ایک کافر دُنیا کے مقابل ہونے کے لئے تیار ہوگئی - اور برملا اپنے یقینِ الوہیت اور توحید کی منادی کرنے پر مجبور کر رہی ہے -

پھر فرماتے ہیں - اس ہدایتِ مزید پر جب ہم نے دیکھا - کہ وہ اعلان کرنے کے لئے تیار ہوگئے - تو ہم نے اُن کے دلوں کو اور مضبوط کر دیا - اور کھُلا اعلان کروا دیا - لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖ - اس کے سوا کسی کو نہیں پکار سکتے - یا نہیں پُکاریں گے - اور اگر ایسا کریں گے - تو عقل سے دُور کی بات ہوگی - سوچئے بادشاہ کافر - حکومت کافر - رعایا کافر - غرض تمام ماحول کفر سے بھرپور اور ہر طاقت اُن کے ساتھ - مال و اقتدار کے سوا کثرتِ افراد کی طاقت لیکن جب یہ اللہ کے بندے پوری طرح ایمان لے آئے - اور اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص ہدایت کے انوار پھینک دیئے - اور جب وہ اعلان کے لئے تیار ہو گئے - تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اتنا مضبوط بنا دیا - کہ کسی کے خوف کا خیال تک نہ آیا - یہ ایمان کی آخری دولت ہے - ساری دنیا ایک طرف - اور یہ چند افراد صاحبِ ہدایت ایک طرف - اقبالؒ نے خوب کہا - ؎

عشق ہو مصلحت آمیز تو ہے خام ابھی

ولایت | یہ دولت ولایتِ ربی تک پہنچاتی ہے - اور یہ ہی ایمان ہے - اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ه

اس وقت تمام حقائق کفر و نور سامنے آجاتے ہیں۔ اور کفر کی کوئی صورت بھی
پوشیدہ نہیں رہتی۔ اندھیرا اندھیرا ہو کر نظر آتا ہے اور نور نور۔ ہر ایک دوسرے
سے الگ۔ اس وقت صاحبِ ولایت قربِ الٰہی میں تیرتا پھرتا ہے۔ اور
دنیاوی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔ تبھی تو کہتے ہیں۔ کہ اگر کسی دوسری
ہستی کا خیال بھی کریں گے۔ تو عقل سے دُوری کی نشانی ہے۔ ورنہ ان
جیسے لاکھوں انسان اپنے کفر میں مدہوش عقل کی صورت سے کفر کو پسند
کئے ہوئے تھے۔ اور اپنے کفر پر نازاں تھے۔ اور موحدینِ خدائی کو نفرت
کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کہ آخر ان مٹھی بھر جوانوں کو ان سے جان بچانے کے
لئے پہاڑ کی کھوہ اختیار کرنی پڑی۔

سوچئے اور خوب سوچئے۔ آج علل واسباب والے ایماندار اتنی
ہمت دکھا سکتے ہیں۔ کہ دنیا کو چھوڑ ایک زاویۂ خاموشی میں جا کر تمام
سامانِ عیش و زندگی کو خیر باد کہہ سکیں۔ اور ہاتھ دھو بیٹھیں۔

جوشِ ایمانی اپنی توحید کا اعلان ایسے ماحول میں جس میں ایک بھی مُوحّد
نہ تھا۔ اور حکومت واقتدار مشرکانہ ہو کچھ تھوڑی ہمت کا کام نہ تھا۔ لیکن جب
کسی یقین کو پختگی نصیب ہوتی ہے۔ تو صاحبِ یقین وایمان اپنے جذبۂ یقین اور
محبت میں اتنا سرشار ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی زندگی ومعیشت سے بے پرواہ ہو کر
وہ کچھ کہہ دیتا ہے۔ جو ایک پوری قوم نہیں کہہ سکتی۔ چنانچہ اس چھوٹی سی
ایماندار ٹولی نے اپنا توحیدی اعلان اور ساتھ ہی غیر اللہ، الٰہوں سے بیزاری
علی الاعلان کر دی۔ تو اس پر ہی بس نہ کی۔ بلکہ کھلے الفاظ میں ان کے مشرکانہ

عقیدہ کی تذلیل کی۔ اور ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ (دیکھو) اس ہماری قوم نے اُس کے سوا کئی خدا پکڑ رکھے ہیں۔ کیوں نہیں یہ کوئی کھلی دلیل پیش کرتے۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے والے سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے؟۔

دیکھئے کتنی للکار سے قوم کے عقیدے کی تذلیل کرتے ہیں۔ کہ کوئی دلیل ہے۔ تو لائیے۔ پھر کس جوش سے آخری کلمہ کہا گیا۔ کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والے سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے۔

سبحان اللہ جب سچ دل میں سما جاتا ہے۔ اور حق کا حال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کسی کی مجال نہیں ہوتی۔ کہ کوئی مقابلہ کے لئے سامنے آئے۔ کتنی تذلیل کرتے ہیں اور علی الاعلان کرتے ہیں۔ اور ساری قوم کو مخاطب کرتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہوتی۔ کہ ایک لفظ بھی سامنے آکر کہے۔ یہ ہے حقیقی جوش ایمانی اور غیرت اسلامی کا نمونہ۔ اس اعلان اور احقاق حق کے بعد جہاں اپنی قوم میں رہنا مشکل ہو گیا۔ تو ٹولی کے کسی فرد نے مشورہ دے دیا۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝

اور جب تم اور اللہ کے سوا جن کو وہ پوجتے تھے الگ ہو گئے۔ تو اب اس کھوہ میں جا کر ٹھیرو۔ اللہ اپنی رحمت تم پر پھیلائیگا۔ اور تمہارے کام کو با آرام بنا دے گا۔

کیا خوب مشورہ پیش کیا۔ اور کس دلیری سے دنیا کو چھوڑنے کی پیشکش کی۔ اور پھر کتنے پاک بھروسہ پر۔ کہ رب کریم اپنی رحمتوں سے ہمیں ڈھانپ لے گا۔ اور ہمارا حصۂ زندگی آخرت جس کے لیے ہم نکل آئے ہیں۔ ٹھیک اور درست فرما دے گا۔ اور ہم ایک پاک باآرام زندگی پسند کریں گے۔

یقین | ؎ یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ایمان کیا ہے؟۔ مولائے کریم اور اس کی حکمتوں پر یقین۔ جب یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اور نیک ظن کسی کا مولائے کریم سے ہو جاتا ہے۔ تو مشکلیں خود بخود دُور ہو جاتی ہیں۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ کی واضح مثال ایک نہیں سینکڑوں دیکھی ہیں۔ جب کسی اللہ کے بندے نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اور اُسے کارسازِ حقیقی خیال کیا۔ تو پھر اُسے کسی دوسرے کے سہارے اور کارسازِ مجازی کی ضرورت نہیں رہی۔ اور وہ سامان پیدا ہو گئے جو عقل اور فہم اور خیال تک نہ آئے تھے۔ اس قصہ میں بھی یقین ہی یقین تمام مشکلات ظاہر و باطن کا حل آپ دیکھیں گے۔

غور | سوچنا یہ ہے۔ کہ یہ ٹولی فقرا کی ہے۔ یا طلبائے مدرسہ کی؟۔ مدرسہ کو جا رہے ہیں۔ یا کسی خانقاہ کا راستہ لئے ہوئے؟ چلنا چاہتے ہیں اور اپنے پاس بے سروسامانی کا سامان رکھتے ہیں۔ یا سامانوں سے بھرے اونٹ لے جا رہے ہیں؟۔ اور پھر کس مقصد کے لئے سفر ہے۔ کوئی تجارتی خیال ہے یا صرف مولائے کریم کی محبت سے سرشار ہو کر اللہ کے دیکھنے کی تمنا میں؟ دنیا

١٣٨

کے تعلقات کو ختم کر رہے ہیں۔ یا تعلقات کے جوڑ کے لئے یہ خلوت اختیار کر رہے ہیں۔ بے شک دنیا میں دنیا کے سوا جینا مشکل ہے لیکن یہ لوگ عام قماش کے آدمی ہیں۔ جن کا نظریہ ہے کہ دنیا کے سوا زندگی مشکل ہے۔ یا اس نظریۂ زندگی سے بلند ہو کر پیٹ کی زندگی چھوڑ کر کسی اور زندگی کی تلاش میں ہیں۔ جس کے اندر فکر پیٹ کی نہیں۔ صرف ایک محبت ہی محبت ہے۔ اور عقل و فکر سے بڑھ کر روحانی مشاہدات کی دنیا ہے۔ جس کے اندر سراسر یقین ہی یقین ہوتا ہے۔ زندگی بھی یقین اور موت بھی یقین۔ شک کو گنجائش نہیں رہتی۔ وہی شک جس کے بغیر ہم تم ایک لمحہ بھی نہیں گذار سکتے۔ نیک و بد بھی شک کی رو میں چلتا ہے۔ آج آخرت کی زندگی۔ سراسر شک ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آخرت کی فکر معیشتِ دنیا نے اٹھا ہی دی۔ ورنہ کسے موت کا یقین نہیں؟ ہر زندہ کو اپنی موت سامنے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے؟۔ کہ اس یقین کے اندر بھی شک پیدا ہو گیا۔ اور انسانی فکر کسی کام کا نہیں رہا۔ "دھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا" کے مصداق ہو بیٹھا۔

قصہ کی غرض و غایت

اس قصۂ اصحابِ کہف کو بھی اس غرض سے پیش کیا گیا۔ تاکہ صاحبِ عقل و ہوش آخرت کی زندگی کا سبق حاصل کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ اللہ تعالٰے کیسے زندہ رکھتا ہے۔ جبکہ سامانِ خورد و نوش مہیا بھی نہ ہو۔ اور کیسے ان کی زندگی سے سبق دلاتا ہے۔ اور وقت کے لوگوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ کہ تم کیوں غفلت میں گذر رہے ہو۔ آخر کچھ موت کا فکر بھی چاہیئے۔

غلط خیال بعض عام سطح کے لوگ نہیں۔ اچھے خواص صاحب علم بھی اعتراض اور شک پیدا کرتے ہیں۔ کہ ساری دنیا اگر اس آخرت کی زندگی کے لئے سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ تو دنیا کا کیا بنے گا۔ یہ ایک ایسا مغالطہ ہے۔ جو شیطان الرجیم کے بڑے دھوکوں سے ہے۔ کوئی کام ساری دنیا جب نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہے۔ تو پھر کیسے خیال کر لیا جاتا ہے۔ کہ ساری دنیا آخرت کے لئے دنیاوی زندگی چھوڑ بیٹھے گی۔ بلکہ ہر ایک کی فطرت اپنی فطرت کے مطابق اپنے کام کاج کو پکڑتی ہے۔ نہ تو ساری دنیا عالم ہو سکتی ہے۔ اور نہ جاہل رہ سکتی ہے۔ اسی طرح مثالی آدمیوں کی کمی نو اتنی ہے۔ کہ ایک آدھ آدمی بھی سینکڑوں میں ہو جاوے تو غنیمت۔ علم میں یکتائی بھی اتنی ہی مشکل ہے۔ جتنی فقر کی یکتائی مشکل ہوتی ہے۔ تاہم کچھ نہ کچھ علم ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس یکتائے علم کی روشنی سے روشنی حاصل کی جا سکے۔ اسی طرح فقر کی یکتائی سے بھی اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جب فقر سے مناسبت کچھ پیدا ہو۔ اور یہی سُنّت اللہ جاری ہے۔ بعض لوگوں کو آخرت کے لئے چُن لیا جاتا ہے۔ اور وہ تن، دھن کو چھوڑ کر صرف اُس راہ میں چل نکلتے ہیں۔ تا آنکہ اُس دولتِ عظمیٰ سے مسرور ہوتے ہیں۔ جس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ یعنی معرفتِ الٰہیہ کے سُرادقات تک جا پہنچتے ہیں۔ اور پھر اُن سے خواص و عوام کو فیضِ الٰہی پہنچتا ہے۔ جیسے دُنیا میں ایک دُنیادار کمال تک دُنیا کو پہنچاتا ہے۔ اور اس کی کمائی سے دُنیا فائدہ اٹھاتی ہے۔ نہ تو ساری دُنیا دولت مند ہو سکتی ہے۔ اور نہ فقیر۔ بعینہٖ یہی خیال اہل فقر کا ہے۔ وہ ساری دنیا کو فقر کے لیئے تیار کرنے پر دُنیا

سے بے تعلق نہیں کرتے۔ بلکہ چند نفوس جن کی فطرتاً مناسبت دنیا بیزاری کی ہوتی ہے۔ انہیں تربیت دی جاتی ہے۔ اور باقی دنیا سے دنیاوی تعلق کو چھوڑنے کے لئے اتنا کہا جاتا ہے کہ

حلال و حرام کی تمیز رکھیں۔ اور غفلت سے بچیں۔ عبادت اور اوامر و منہیات پر مضبوط جم جائیں۔ باقی ان کو اوامر کے ترک کرنے اور مجاہدات شاقہ پر عادی ہونے کے لئے نہیں کہا جاتا۔ یا مال و دولت اور اولاد سے متنفر نہیں کیا جاتا۔ لیکن چوٹی کے آدمی جنہیں انسانی دنیا کا مرشد بننا ہوتا ہے۔ انہیں اس بندِ دنیا سے خلاصی دلائی جاتی ہے۔ اور ان کو دنیا سے اٹھا کر عرشِ مجید پر بٹھانے کے لئے وہی سبق "دنیا بیزاری" دیا جاتا ہے۔ تاکہ دنیاوی تعلق سے الگ ہو کر صرف اس ذاتِ حق سبحانہٗ کے ہو کر دنیا کی رہنمائی کا فریضہ ادا کریں۔ اور شاہ و گدا۔ جاہل و عالم اُن سے سبق لے۔ اور دنیا و آخرت کے لئے رہنمائی حاصل کریں۔ غرض اس مقام بلند کے حاصل کرنے کے لئے دنیاوی تعلقات زہرِ قاتل ہیں۔ اور جب تک ان تعلقات کو ختم نہ کرایا جاویگا۔ مولٰے کریم کی جھولی میں میٹھنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ قصہ بالکل اسی مثالی توضیح کے لئے مولٰے کریم نے قرآن حکیم کے ذریعہ آیاتِ محکمات کے حکم میں بطور ہدایت مرحمت فرمایا۔ اب ہمارا فرض ہے۔ کہ اس کے تمام انوار اور اسرار سے فائدہ اٹھائیں۔ اور ایک ایک لفظ سے ہدایت حاصل کریں۔ اور شک و شبہ کو گنجائش نہ دیں۔

یاد رکھئے۔ سولہ آنے یہ صحیح ہے ؎

یادِ او سرمایۂ ایماں بود

ہر گدا از یادِ او سلطاں بود

ایک نہیں لاکھوں کو اس کی یاد پر شاہی نصیب ہوئی۔ یہی بلالِ حبشیؓ کیا تھے؟۔ اور سرہندیؒ کیا تھے؟۔ اُن کو درویشی سے پہلے کون جانتا تھا۔ ؎

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا

ترے عشق نے بنایا مری زندگی فسانہ

ان کی درویشی کے سامنے بادشاہ جُھک گئے۔ اور ان کے جوتے اٹھانے فخر خیال کرتے گذرے۔ یہ تو ایک دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن اس سرزمینِ ہند میں لاکھوں بندگانِ خدا نے یہ رُتبہ پایا۔ کہ دنیا غلام ہو کر رہ گئی۔ اور بادشاہوں سے بڑھ کر اُن کا وقار دنیا میں قائم ہو گیا۔ اور ان کے ارشاد کی تعمیل ایک دنیا نے کی۔ اور ہدایت پائی۔ اور فلاح سے ہمکنار ہوئے۔

یہی مثال اصحابِ کہف کی دیکھ لیجئے۔ کہ ابتدائً کس بے رحمی سے گھر کو خیر باد کہا۔ ساری دنیا اُن کی دشمن تھی لیکن جب کھوہ (الکہف) کی زندگی کے بعد باہر نکلے۔ تو ایک دنیا اُن کی شیدائی ہو گئی۔ شاہِ وقت تک جُھکا۔ اور اُن کی اس زندگی کہفی سے اللہ تعالےٰ کو رحم آیا۔ اور ساری دنیا کو ایک دین کے لئے ہموار کر دیا۔ جو دین چند آدمیوں کا تھا۔ اور جس کی وجہ سے انہیں شہر بدر ہونا پڑا تھا۔ یہ مولیٰ کریم کی قدرتِ کاملہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اس ہجرت اور ترکِ وطن پر جو سراسر مخلصانہ اور صرف ذاتِ الٰہی کے لئے تھا رحم کھایا۔

یاد رکھیئے - اور ہمیشہ یاد رکھیئے - کہ اخلاص کی ابتدا ابتلا ہوتی ہے - اور اخلاص کو دیکھنے کے لئے ایسے پتال جنتر سے کھینچا جاتا ہے - جس کا خیال نہیں ہوتا لیکن جب امتحانِ الٰہی سے کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ نکل جاتا ہے - اور اس آزمائش سے کامیابی ہو جاتی ہے - تو مولےٰ کریم اس اپنے بندے کے ہو رہتے ہیں - اور پھر جو وہ چاہتا ہے - ہو جاتا ہے - یعنے ایک طرف کوئی خیال آیا - دوسری طرف وہ خیال پورا ہو گیا - سالک کو خود پتہ چل جاتا ہے - کہ کُن سے کیسے دُنیا پیدا ہوئی - ایک ارادہ اور صرف ایک کلمہ کُن سے دُنیا پیدا ہو گئی اور ہوتی جا رہی ہے - اس آیت کے بعد اب صورت الکہف دکھائی جاتی ہے - کہ وہ کیسی تھی :-

الکہف کا نقشہ

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ	تو (اے مخاطب) دیکھے - کہ سورج
تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ	جب چڑھتا ہے - تو اس کھوہ کے
ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ	داہنے طرف سے نکل جاتا ہے - اور
تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ	جب ڈوبتا ہے - تو ان کے بائیں جانب
وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ	سے کترا جاتا ہے - اور وہ ایک کھلے موقعہ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ	پر اس میں ہیں - یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں
يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ج	ہیں اور نشانات جس کو اللہ تعالیٰ راہ

لہ ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع الخ

وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ دکھائے وہی راہ درست پر ہوتا ہے۔ اور جسے بُھلا اور بہکا دے۔ تو پھر اس کا کوئی رفیق راہِ ہدایت پر لانے والا نہیں۔

آیت آپ کے سامنے ہے۔ اپنے اپنے خیال میں اس کی صورت بنائی گئی۔ میرے خیال میں اس کا ایک سرا شمال مغرب۔ اور دوسرا سرا جنوب مشرق کی طرف تھا۔ اور کئی میل لمبی تھی۔ جس کے میان میں کچھ چوڑائی کی جگہ ایسی تھی۔ جس پر چھت سا کچھ تھا۔ یعنے پہاڑ کا الٹا ہوا حصہ تھا۔ جس کے نیچے وہ آرام سے رہتے تھے۔ اور نہ دھوپ کی تکلیف تھی۔ کیونکہ صبح سویرے دُھوپ کو پہاڑ کی دیوار دائیں طرف سے بچاتی تھی۔ اور ویسے ہی شام کو دوسری جانب کی دیوار کھوہ ان کو بچاتی تھی۔ پھر دوپہر کو وہ "فجوہ" یعنے جو چوڑائی درمیان میں دونوں دیواروں کے پیدا تھی۔ انہیں آرام دیتی تھی۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ محلِ وقوع بھی الکھف کا گرم علاقہ میں تھا۔ جہاں سردی یا تو ہوتی نہ تھی۔ یا بہت کم۔ جس کے بچاؤ کے لئے کسی اسباب کی ضرورت نہیں تھی۔ ورنہ گرمی زیادہ اس علاقہ میں تھی۔ لیکن الکہف کا وقوع ایسے تھا۔ کہ خود بخود دھوپ سے بچاؤ ہو جاتا تھا۔

مولانا آزاد (مرحوم) نے اپنے تفسیری نوٹ میں لکھا ہے۔ الرقیم۔ بمعنے مرقوم تختی نہیں۔ بلکہ الرقیم وہی شہر ہے جس کا ذکر تورات میں راقیم کے نام سے آیا ہے۔ اور جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ کے سیدھے شمال کی طرف دو پہاڑی سلسلہ کی سطح مرتفع پر واقع تھا۔ جسے مغربی پیٹرا اور عربی بصرہ کہتے ہیں۔ وہاں واقع تھا۔ یہیں

نے یہ نوٹ اس لئے دکھایا۔ کہ یہ معلوم ہو جائے۔ کہ وہ گرم تھا۔ نہ کہ سرد۔ کیونکہ سردی کے بچاؤ کی ضرورت واقع ہوتی۔ ویسے مذہبِ عیسوی کی مرکزیت کے قریب بھی تھا۔ اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خیال بھی آتا ہے۔ کہ الکہف کے ساتھ جب الرقیم کو جوڑ دیا گیا۔ پھر لامحالہ تختی نقوش یا محررہ اختیار کرنا زیادہ اونٰے ہے۔ بہرصورت یہ کہف وکھوہ ان کے گھر کے بہت قریب نہ تھا۔ کیونکہ جملہ فَأْوُا إِلَى الْكَهْفِ سے ہاں وہ معلوم ہو گی لیکن آبادی سے دُور اور آبادی سے خالی ۔ کیونکہ اس زمانے کھلی زمین بھی بہت کم آباد تھی۔ ایسے حال میں کھوہ کی آبادی کا خیال تک نہیں ہوتا۔ درخت بھی غالباً نہ ہوں گے۔ ورنہ ان کے سایہ کی طرف اشارہ ہوتا لیکن باہمت مردانِ خدا کے لئے وہ جنّتِ ارضی ہو گیا تھا۔ اب اس کے بعد اس حال کو بیان کیا جاتا ہے۔ جو اس کھوہ کے اندر ان پر وارد ہو گیا۔ اور ان کی صورت و سیرت میں نمایاں تبدیلی کا باعث ہُوا۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ط وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ط لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝

تو جانے وہ جاگتے ہیں لیکن وہ سوتے ہیں اور ان کی کروٹیں دائیں بائیں ہم بدلتے ہیں۔ اور اُن کا کتا چوکھٹ پر ہاتھ پھیلائے ہے (اے مخاطب) اگر تُو اُن کو جھانک دیکھے تو پیٹھ دے کر بھاگے اور بھر جاوے اس کی وحشت تجھ میں۔

آپ ترجمہ دیکھ چکے لیکن تمام قصہ کی جان یہی ہے۔ اور اس آیتہ پر مختلف خیالوں نے سلے دے کر کے قصہ کی حقیقت کو ایک دوسرے سے بہت دُور جا پھینکا۔ اور کسی ایک حقیقت پر اتفاق نہیں ہُوا۔

اَیۡقَاظًا وَّ ھُمۡ رُقُوۡدٌ پہلے دھو کا ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ اور تقدم تاخر سے کہیں سے کہیں دُور نکل گئے ہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ سوتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں کھلی ہونے کی وجہ سے جاگتے نظر آتے ہیں لیکن پچھلے مفسرین یہ نہیں مانتے۔ کہ آنکھیں کھلی ہونے پر ایک مردہ کو زندہ خیال کیا جاوے۔ لیکن باوجود اس طرف ان کا ذہن جانے کے اصل مطلب ان پر نہیں کھل سکا۔ پھر اسی لکیر پر چل دیئے۔

عاجز کا خیال یہ ہے اور انشاء اللہ درست بھی ہوگا۔ مخاطب کو کہا جاتا ہے۔ کہ تو اُن کو جاگتا خیال کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ سوئے ہوئے ہیں۔ یہ جاگتا تو اُس وقت خیال میں آتا ہے۔ جب وہ چلتے پھرتے نظر آتے ہوں۔ یا کوئی ایسا کام کر رہے ہوں جن سے جاگتا معلوم ہو۔ بلکہ جاگتے میں تو کچھ شک نہیں رہا جب دیکھنے والا اُن کو جاگتا خیال کرلے لیکن دوسری بات ایسی ہے جس کو خود اللہ تعالےٰ اپنی طرف سے "وَھُمۡ رُقُوۡدٌ" حالانکہ وہ سوتے ہیں۔ بیان فرماتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ یہ کیا حال ہے۔ ایک طرف جاگنا اور دوسری طرف اُن کا سونا تصوّر کرنا درست ہو۔

اصل میں مولےٰ کریم نے اُن کی وہ حالت بتلائی ہے۔ جو ایک اللہ اللہ کرنے والے کی ہو جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے دھیان میں سب کچھ بھول جاتا ہے

۱۲۶

اور محبت کی غنودگی چھا جاتی ہے۔ دیکھنے والا سالک کو دیکھتا ہے۔ کہ وہ مشغول کا ہے لیکن اُس کا اندرونی حال ایسا ہوتا ہے۔ کہ باوجود شغل کے وہ ایک سوئے ہوئے کی طرح جذبات زندگی سے پاک ہوتا ہے۔ جس میں یکسوئی کے مراحل اپنے حال سے اسے ایسا کر دیتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات کا احساس تک نہیں رکھتا چہ جائیکہ دوسری دنیا کی طرف اُس کی آنکھ ہو۔ یا کچھ اُسے احساس ہو۔ وہ سراسر محبت میں غرق، مدہوش ہوتا ہے۔ مولیٰ کریم نے ان الفاظ میں اس حال کی تعبیر کو بیان فرمایا لیکن عام دنیا چونکہ اس حال سے ناواقف ہے۔ اس لئے اس حال کی تعبیر پر طرح طرح کے خیالات من گھڑت لکھتے چلے گئے۔ اور کیا عجب اُس وقت کے لئے وہی کچھ مفید ہو لیکن آج جب علوم انتہا تک پہنچ گئے۔ ماہرینِ نفسیات نفسی حالات سے باخبر ہو گئے۔ تو اب ان الفاظ کے معانی اور ان کی حقیقت سمجھنے میں کچھ مشکلات نہیں بلکہ سیدھی سادی بات ہے۔ جو کسی کے عقل میں نہیں سمائی۔

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ — ہم دائیں بائیں اُن کو ہلا (پھیرتے) دیتے ہیں۔

چونکہ اصحاب کہف کو پہلے جملے سے یہ تصور کر لیا گیا تھا۔ کہ وہ سوئے ہوئے ہیں (وَهُمْ رُقُودٌ) تو پھر اس جملے کے سیدھے سادے معنے کو الٹنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور یہ مطلب نکالا گیا۔ کہ ان سوئے ہوئے کے پہلو دائیں بائیں اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے بدلواتے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کے پہلو زمین پر لگنے سے سڑ نہ جائیں۔ حالانکہ اس تاویل کی بعد میں ضرورت نہ تھی۔ اگر پہلے جملے کے معنے صحیح کر لئے جاتے۔ سیدھے سادے معنے یہ ہیں۔ کہ ہم اُن کو ادھر دائیں طرف

اور اودھر بائیں طرف پھیرتے رہتے ہیں۔ عام محاورہ کلامِ حکیم میں آتا ہے۔ کہ انسانی افعال پر گاہ گاہ مجازی پردہ کو چھوڑتے ہوئے حقیقی راز کو افشا کر دیتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ بعینہٖ یہاں یہی حال ہے۔ جب ان کے جذباتِ اندرونی کو محبتِ خاصہ نے کھا لیا۔ اور کوئی جذبہ اور خواہش نہ رہی۔ تو اب اُن کی حرکت حرکتِ الٰہی کے ماتحت ہو گئی۔ الکہف کے اندر اِدھر اُدھر پھرانے کو اپنی طرف منسوب کیا۔ ورنہ سونے کے ساتھ دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ سوتے بھی ایسے ہوں گے۔ جیسے جاگتے۔ یعنی سونا بھی اُن کا منسوب الی اللہ ہوگا۔ یا آرام سے بیٹھنا بھی۔ غرض میری سمجھ میں تو یہ آتا ہی نہیں۔ کہ اَیْقَاظًا کے ساتھ رُقُوْدٌ لگانے سے نیند دائمی اُن پر چھائی ہوئی تصور کی جائے۔ بس ایک حال ہے جس کو مولیٰ کریم نے بیان فرمایا۔ پھر اس حال کے مطابق ان کے چلنے پھرنے کو اپنی طرف منسوب کیا۔ کیونکہ ان کے اندر کوئی ارادہ نہ رہا تھا۔ محبت کتی اور صرف محبت اور بس۔

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ

جب کوئی کسی کا ہو جاتا، تو دروازے کا کتا۔ چوکھٹ کا کتا محاورہ استعمال ہوتا۔ یہ بھی ایک محاورہ ہے۔ جب کتا کسی کے در کا ہو رہتا ہے۔ تو اِدھر اُدھر سے گھوم کر چوکھٹ پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اندر نہیں گھستا۔ نتیجہ خیال یہی ہے۔ کتا حسبِ معمول اُن کے آتا جاتا ہوگا۔ اور جب وہ۔ فجوہ۔ دالان پر پہنچتے ہوں گے۔ تو فجوہ کی چوکھٹ سے ہاتھ پھیلائے بیٹھ جاتا ہوگا۔ چونکہ ایک طویل عرصہ ایسا ہوتا رہا۔ تو ایسے الفاظ سے کیا تعبیر فرمائی گئی! کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہاتھ پھیلائے چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔

۱۷۹

لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ اب یہ تیسرا جملہ بیان کرتا ہے۔ کہ اے
لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔ مخاطب اگر تو اُن کو جھانک کر دیکھے تو
پچھلے پاؤں اُن سے بھاگ نکلے۔ بے شک مُردوں کو دیکھنے سے خوف آتا ہے۔
لیکن دوسرا جملہ اس خوف کو رُعب کے ساتھ بدل دیتا ہے۔
وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ٥ یہ تو زندوں سے اور ان زندوں سے
جن کی شکل و شباہت بھی پُر شوکت ہو۔ اکیلے زندہ سے بھی رُعب اُٹھنا مشکل ہوتا
ہے۔ یہ رعب و شوکت حالِ محبت و عشقِ الٰہیہ سے اٹھتا ہے ٥

ہیبتِ حق است آں از خلق نیست ہیبتِ آں مرد صاحب دلق نیست
ہر کہ ترسید از حق و تقوے گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

خطاب کلام کا خطاب بظاہر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے
کہ حقیقی مخاطب اللہ تعالیٰ کے وہی ہو سکتے ہیں لیکن حقیقتاً ہر وہ شخص مخاطب ہے
جو یہ کلام معجز سُنتا ہے۔ یا پڑھتا ہے۔ عام اسلوب قرآن حکیم ایسے ہی ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيْلِ ٥

تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا الآیۃ

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ الآیۃ

غرض یہ ایک بلیغانہ طریقہ کلام کا ہے کہ سننے والے پر پوری قوت سے خطاب کے
لہجے میں فرمایا جاوے۔ اس لئے اس خطاب کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
مخصوص کرنے کے بجائے عام خیال کیا جاوے۔ اور سننے والا اور پڑھنے والا

اس خطاب کا مخاطب ہے۔

سگِ اصحابِ کہف

کہتے ہیں یہ کُتا ایک گڈریا (آجڑی) کا تھا جو ریوڑ چراتا تھا۔ جب اصحاب کہف کا ٹولہ اس کے پاس سے گذرا تو اس نے صورتِ حال دریافت کی۔ چونکہ وہ اللہ والے تھے۔ اور ان کے چہرے حال کی حلاوت سے بھرے تھے۔ اِسے بھی اُن کی ہمراہی کا شوق ہو گیا۔ اور ریوڑ چھوڑ تا ساتھ ہو گیا۔ کُتّے کو ہر چند دھتکارا لیکن اُسے اللہ تعالےٰ نے زبان دی اور اس نے کہا۔ تم جاتے ہو۔ تو میں اِس پاک گروہ کے ہمراہ کیوں نہ جاؤں؟

اس کے علاوہ میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ جو کچھ اس نے کہا زبانِ حال سے اور اپنی آنکھوں سے کہا۔ جب محبت والے کی آنکھیں دو چار ہو جاتی ہیں۔ تو آنکھیں وہ کچھ محبت کے اسرار ایک دوسرے تک پہنچاتی ہیں۔ جو زبان پر نہیں آ سکتے اور نہ ہی زبان و دل کو اُن کے بیان کرنے کی توفیق اور طاقت ہوتی ہے۔ گڈریے نے جب دُھتکار کر دیکھا ہوگا۔ تو کُتّے کی آنکھوں نے اپنی محبّت بھرا دل پیش کر دیا۔ پھر کس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ محبت بھری آنکھ کے مقابلے میں اسے دھتکارے اور اپنے سے ہٹائے۔

فیضانِ نظر

فیضانِ نظر سے کسے انکار ہے۔ اقبال مرحوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

حقیقی نظر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

لیکن فیضانِ نظر کا درجہ یہاں ایک اور بڑھ گیا ہے۔ وہ باپ تھے یہ بیٹے لیکن یہاں ایک جانور اور جانور بھی وہ جسے دُنیا نجس اور پلید خیال کرتی ہے لیکن فیضانِ نظر نے اُسے کہاں پہنچایا۔ قرآنِ حکیم شاہد ہے۔ حدیث فرماتی ہے۔ کہ یہ جنّت میں ان کے ہمراہ جائے گا۔ جن کے درِ دولت کا وہ ہو رہا ہے۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

سگِ اصحابِ کہف روزے چند   پئے نیکاں گرفت، مردم شد
پسرِ نوحؑ با بداں بنشست   خاندانِ نبوتش گم شد

محبّت

محبّت بڑا اثر رکھتی ہے۔ اور جیسی محبت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ سلوک الی اللہ میں کیوں محبتِ پیر مقدم رکھی ہے۔ اور کیوں مربی کے ساتھ رہنے کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ محبت سے فیضِ نظر کے علاوہ جو انوار قلبی کو مرید پر پھینکتی رہتی ہے۔ ایک طرح سے رفاقت اور مصاحبت اور خدمتگذاری سے انس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس انس کی وجہ سے انوارِ مربی طالب کے دل کو کھا جاتے ہیں۔ اور دوئی کا شائبہ تک اٹھا دیتے ہیں۔ اور پیر و مرید میں دوئی کی گنجائش نہیں رہتی اس وقت وہ حدیث سامنے آجاتی ہے۔ کہ جو کچھ میرے سینے میں ڈالا گیا ہے میں نے وہ ابوبکرؓ کے سینے میں ڈال دیا۔

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ اُن کا کُتّا بازو پھیلائے چوکھٹ پر ہے ۔کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ۔کہ وہ کُتّا اُن کا ہو رہا تھا ۔اور محبت کے مارے ہر وقت اُن کے دربارِ عالیہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے تھا ۔کُتّے کی عام عادت ہے جب کسی سے اُسے پیار ہو جاتا ہے ۔تو ایسی صورت میں اس کے سامنے بیٹھ کر آنکھ کو اپنے مربی کے قدموں پر رکھے رکھتا ہے ۔اور نظر کو ایک لمحہ بھی اِدھر اُدھر نہیں پھیرتا ۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے ۔کہ حکم کا منتظر ہے ۔اور یا محبت کی وجہ سے آنکھ لڑائے ہوئے دُم ہلاتا ہے ۔جس سے اس کی محبّت کا اظہار ہوتا ہے ۔اصل میں یہ حال اس غرض سے پیش کیا گیا ۔لیکن اہلِ علم دوسری طرف متوجہ ہو گئے ۔اور اسے پاسبان کی خدمت میں دکھایا ۔بھلا ایسے جنگل میں ایک کُتّا صرف بھونکنے کے سوا کیا کر سکتا تھا ۔اور میرا ذاتی تو یہ خیال ہے ۔کہ جس دن سے وہ اُن کے ہمراہ ہُوا ہو گا ۔بھونکنا بند ہو گیا ہو گا ۔اور سر ڈالے اُن کے ہمراہ ہو گا ۔اور جہاں وہ جاتے ہوں گے ۔وہاں ان کی دہلیز پر سر ڈالے نظر آتا ہو گا ۔کیا عرض کروں فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست ۔اصحابِ کہف کا تو خود مولے کریم نگہبان تھا ۔کتے بیچارے کی کیا طاقت اور اگر دونوں باتوں کو تسلیم کر لیا جاوے ۔تو کیا حرج خدمت گذار عاشق اپنی محبت کے ساتھ ان کی خدمت سے بھی خالی نہیں رہتے ۔یہ بھی تھا ۔اور وہ بھی تھا ۔بہر صورت عام خیال میں کوئی اچنبا (عجیب بات) نہیں ۔جس کی وجہ سے اسے ذکر کیا جاوے ۔البتہ یہ محبت ہی ایک ایسی دولت ہے ۔جس کے لئے ذکر ہوتے ہیں ۔خود اصحابِ کہف کا قصہ ایسی محبت

کی نشان دہی کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ آج یہ قصہ اور کیوں اصحابِ کہف ابھی تک زندہ ہیں۔ صرف محبتِ الٰہیہ کی وجہ سے۔ ے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ایک وہم

کسی کا یہ خیال ہو۔ کہ متقدمین نے تو اصحابِ کہف کو سوتے بتایا۔ اور نیند طاری ہو جانے سے کھانے پینے کی ان کو ضرورت نہ ہوئی۔ اب بیداری میں لوازمات بیداری سے کھانے پینے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی مدت کیسے بن کھائے بن پئے گذار سکتے تھے۔

لیکن سوچا نہیں گیا۔ صرف نیند اگر طاری ہو۔ تو بھوک زیادہ لگتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہضم بیداری سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور جب بھوک تیز ہو جاتی ہے۔ تو نیند خود بخود اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ نیند بھی ایسی صورت میں ہمارے خیال کے لئے مؤید ہو سکتی ہے۔ جب نیند کے ساتھ اور حالت بھی ایسی طاری ہو۔ جو بھوک کو بند کر دے۔ تو ہم یہ کہہ دیتے کہ وہی حالت بیداری میں جب طاری ہو جاوے۔ تو کیوں نہ بھوک بند ہو۔

ویسے کوئی قرینہ قرآن حکیم میں موجود نہیں۔ کہ انہوں نے اس مدت میں کچھ نہ کھایا ہو۔ بلکہ بعض الفاظ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ شاید نیند میں رہے۔ جو موت کے برابر خواہشات کے ختم ہونے کی وجہ سے تھی لیکن یہ خواہشات بیداری میں بھی

ختم ہو سکتے ہیں۔ اور صرف ایک لفظ "بَعَثْنٰاھُمْ" ایسا ہے جس کے لئے تمام آیات کے معانی کو الٹنا پڑا۔ اور ایک بہت خیالی تصویر مُردوں کی سی بنانی پڑی۔ میرے نزدیک تو حال ہی اتنا بلند ہو گیا تھا کہ بَعَثْنٰاھُمْ کے لفظ سے اس حال کے نزول کے وقت فرمایا گیا۔ ہر صاحبِ حال۔ بلکہ ہر محب پر ایک حالی غلبہ محبت میں ایسا وارد ہوتا ہے۔ کہ تن من کی خبر نہیں رہتی۔ اور تمام خواہشات مٹ جاتی ہیں لیکن جب محبّت پختہ ہو جاتی ہے۔ اور عروج سے نزول کی طرف روحِ محبت قدم اٹھاتی ہے۔ تو پھر ہوش و حواس درست ہونے لگتے ہیں۔ اور تمام خواہشات عود کر آتی ہیں۔

اصحابِ کہف کھاتے ہوں گے لیکن دانہ غلہ نہیں۔ پھل پتے۔ جو وہاں موجود ہوتے ہوں گے اس پر گذران ہو گی۔ ہر ملک میں اور ہر جنگل اور رکھوہ میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے جلوے برابر نظر آتے ہیں۔ کہ جانوروں کی زندگیاں بسر ہوتی رہتی ہیں۔ چائے کیا پتّے نہیں؟ لیکن کتنے آدمی ان پتوں کو جوش دے کر اب بھی اپنی حیات کا سامان روٹی کے بغیر پاتے ہیں۔ پھر اگر جنگلی مرغ اور پرندوں ہی کو خیال کر لیا جاوے۔ تو بنی اسرائیل کی ایک پوری قوم کی گذران من وسلوٰی پر ہوتی رہی۔ تو کیا عجب۔ چند آدمیوں کی گذران ایسی ہی ہو جاوے۔ من وسلوٰی کیا تھے۔ کچھ پرندوں کا گوشت اور کچھ درختوں پر پڑی ہوئی اوس۔ جو شیرینی کا کام دیتی تھی۔ بہر صورت ہمارے ذہن میں اللہ تعالےٰ کی نشانیوں کی وجہ سے کوئی بات بھی اچنبا (عجیب) معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ نیست سے جب ہست (پیدا کرنے کا) ہم یقین رکھتے ہیں۔ تو پھر ایسی معمولی اشیا کے موجود کرنے میں

۱۵۶

ہمیں کیوں تاویلات میں جانا پڑے - بات صاف ہے - اور کسی قسم کی الجھن ہمارے خیال (نظریہ) میں پیدا نہیں کی جا سکتی - آگے چلیے

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ	اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا - کہ
لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ	لگے آپس میں پوچھنے - ان میں سے
قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ط	ایک نے پوچھا - کتنی دیر تم ٹھہرے -
قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ	تو دوسروں نے جواباً کہا - کہ ہم ایک
يَوْمٍ ط قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ	دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے - کچھ ان
بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ	میں سے بولے - جتنا ہم تم ٹھیرے
بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى	خدا ہی بہتر جانتا ہے - تو ایک کو
الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا	ایک روپیہ دے کر گاؤں میں تو بھیجو -
أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم	کہ اچھا ستھرا لذیذ کھانا تمہارے
بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ	لئے لائے - اور نرمی اور آہستگی سے
وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ہ	جائے اور کسی کو خبر نہ ہونے دے -

اسی بَعَثْنَا کے معنے میں اختلاف پیدا ہوتا ہے - بعثت سے - قیامت کے اٹھنے کو تعبیر اکثر کیا گیا ہے - بعثت انبیاءؑ کے الفاظ سے وہ قیاس یعنی مراد نہیں لیا جاتا - بلکہ انبیاء کا تشریف لانا مراد لیا جاتا ہے - صاحب ترجمہ نے بھی بعثت کے معنے جگا دینے کے کئے ہیں - یعنے ہشیار ہو جانا لیکن اگر اس ہوشیاری کے معنے لے کر پہلے حال سے بیداری مراد لی جائے - تو کیا ادپری بات ہو گی! نہیں اور ہرگز نہیں -

اس بَعثنٰاکے ساتھ جب یہ لَبِثتُنا ہم دیکھتے ہیں یعنی ٹھہراؤ کتنا ہُوا ؟ تو اس کے جواب میں دیکھتے ہیں ۔ یہ جواب ملتا ہے ۔ کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ ۔ تو لامحالہ نیند کی طرف طبیعت چل ہی نکلتی ہے ۔ ورنہ قرآنی قرینہ کوئی ایسا نہیں جس پر یہ فیصلہ کُلی نیند کا دیا جاوے ۔ بلکہ خود قرآنی فیصلہ ہے وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا کہ تو اُن کو جاگتا خیال کرتا ہے ۔ اور وَّ هُمْ رُقُوْدٌ حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں ۔ جیسے پہلے لکھا گیا ۔ کہ ہم کسی طرح ظاہر کو نہیں چھوڑ سکتے ۔ جبکہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں ۔ کہ وہ جاگتے ہیں ۔ سونے کا علم اندرونی قرآنِ حکیم نے بتلایا ۔ کہ کھوہ کے اندر وہ سوئے ہوئے تھے ۔ بے شک اندر اندر سوئے ہوئے ہوں ۔ لیکن ظاہراً تو ہم اُنہیں جاگتا ہی کہیں گے ۔ اور جاگنے کے حکم میں ان کو کہیں گے رہا ان کا یہ کہنا کہ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ۔ یہ وہی نیند باطنی ہے جس کی بابت اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم دیا ۔ اگر وہ نہ دیتے ۔ اور ہم اُنہیں جاگتے خیال کرتے ۔ تو پھر ہمارے ذہن اس طرف کبھی نہ منتقل ہوتے لیکن آخری فیصلہ وہ بھی نہ دے سکے ۔ کہہ دیا تمہارا اللہ ہی ہمارے ٹھہرنے کو بہتر جانتا ہے ۔ اور اچھے طعام کو طلب کرنے کے لئے بعض مفسرین نے لکھا ہے ۔ کہ ان کو چونکہ بھوک زیادہ نہ تھی ۔ اس لئے اچھا اور ستھرا کھانا طلب کیا ۔ ورنہ بھوک میں یہ الفاظ نہ کہتے ۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ کھاتے اور پیتے تھے لیکن جب پہلا حال گیا ۔ تو روزانہ کا

کم لبثتم فی الارض عدد سنین ۝ قالوا لبثنا یوما او بعض یوم فاسئل العآدین ۝ یہاں لبثتم کے معنے "ٹھہرے" یعنی زندہ رہے ۔

کھانا سادہ ہونے کی وجہ سے اتنا مرغوب نہ تھا۔ بلکہ لذیذ کھانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ جو کبھی وہ کھایا کرتے تھے۔ جب محبت میں ہوش آتا ہے۔ تو پھر قدم نیچے گرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور حافظہ میں بھلی اشیا سامنے آجاتی ہیں۔ چنانچہ اب کھانے یاد آئے۔ جو کبھی بازاروں میں کھاتے تھے۔

اس میں شک نہیں اس خیال کے ساتھ معاً یہ خیال پیدا ہو گیا۔ کہ وقت چونکہ کچھ زیادہ نہیں گذرا۔ وہی لوگ اب بھی شہروں میں ہوں گے۔ اور وہی بادشاہی جسے چھوڑ کر آئے ہیں ہو گی۔

مگر یہاں صدیوں کا تفاوت ہو چکا تھا۔ اور کئی انقلابات ہو چکے تھے۔ جو اُن کے علم تک نہ آتے تھے۔ اور آتے کیسے۔ جب اُنہیں اپنے قیامِ کہف کا پتہ تک ہی نہیں۔ کہ کتنا ہم ٹھیرے۔

یہ بھی کوئی قدرتِ الٰہی کے اچنبھے کی بات نہیں۔ کہ ایک طرف سالوں اور قرنوں گزر جائیں۔ اور دوسری طرف ایک آن کا وقت گذرا ہو۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے معراج کے راستہ کا مطالعہ فرمائیے۔ ایک طرف تو دروازہ کی کنڈی ہل رہی تھی۔ اور دوسری طرف آسمانی سیر کی لاکھوں مسافتوں کی سیر ہو چکی تھی۔ اور خود آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کئی سالوں کی سیر کے برابر وقت کو شمار فرماتے تھے۔

غوث علی رحؒ قلندر کے ایک قصہ میں بھی ایسا حال لکھا گیا ہے۔ گو تعجب ہوتا ہے لیکن وہ خود "اس وقت" بیک وقت دو رُخہ ہونے کے قائل ہیں۔ یعنی ایک طرف چند منٹ گذریں۔ اور دوسری طرف ہفتے گذرے ہوں۔

اور کئی ایسے کام سالک نے دیکھے اور دکھائے ہوں۔ جو سُفنہ میں ہونے کے سوا چارہ نہیں رکھتے۔

ایک نکتہ

كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ۔ یہ جگانا، یہ ہوشیار کرنا کس لئے تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ آپس میں اس رہائش کی بابت دریافت کر کے معلوم کریں۔ کہ کتنا وقت گذر گیا۔ حالانکہ ان کے علم میں بہت کم تھا۔ کیونکہ ایک مزے کی زندگی میں تھے۔ مگر جب تک انہیں یہ احساس نہ دلایا جاتا۔ کہ حقیقتاً کتنی مدت گذر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی کا اُن کو کیا پتہ چلتا۔ یہ صرف احساس دلانے کے لئے۔ انہیں اس حال سے نکال کر اس حال میں لایا گیا۔ کہ وہ خدا تعالے کے فضل و کرم کو تو دیکھیں۔ کہ ان پر کیا کیا فضل و کرم ہو گئے ہیں۔ جبکہ وہ اس راہِ محبت میں آئے۔ اور دنیا کو ترک کیا۔ کسی کو دنیا میں ایک آن قلبی آرام و سکون نہیں ملتا۔ اور ان کو مہینوں سالوں نہیں صدیوں آرام و سکون حاصل ہو گیا۔ حقیقتاً زندگیاں کیوں کم ہیں؟۔ اور بیماریاں کیوں زیادہ۔ کچھ تو اس گندمی اناج کی برکت سے کچھ اس دود و دھکھن کی وجہ سے اور کچھ غموم و آلام کی طفیل۔ اور کچھ اندرونی تسکین و تسلی نہ ہونے سے۔ غرض یہی امور زندگی کو ختم کرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن جب اندر سے پریشانی کا جذبہ کھینچ لیا گیا۔ اور سکون و قرارِ قلب عنایت کر دیا گیا۔ تو اب یہ تمام دنیاوی مصائب اور غم خود بخود دور ہو گئے۔ اور عمر خود بخود طویل ہو گئی۔

بعض سادھو اب بھی بناوٹی ڈھنگ میں داخل ہو کر حبس دم کے طریقہ کو استعمال کرتے ہوئے ایک لمبی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وہ دولت پیدا کر دی۔ جو سالوں مجاہدہ کے بعد حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ ہاں سب سے بڑھ کر ان کا وہ مجاہدہ تھا۔ جو دنیا اور دنیا کی عیش کو اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور ایسے سُنج خاموش سنسان میں چلے گئے۔ جہاں دنیا کی ہوا تک نہ لگتی تھی۔ نہ کوئی جاتا تھا اور نہ کوئی آتا تھا۔ صرف یہ تھے اور اللہ میاں۔ خلوت تھی تو اس سے۔ جلوت تھی تو اس کے ساتھ۔ مونس و غمخوار صرف وہی ایک تھا۔ اس کے سوا کوئی سہارا کوئی آسرا نہ تھا۔ یہی فقر کی انتہا ہے۔ کہ تمام بھروسے دنیاوی اُٹھ جاویں۔ اور صرف ایک کارساز حقیقی پر ایمان کامل ہو جاوے۔

پہلی آیت کے ساتھ کہ کیوں دبے پاؤں شہر میں جاویں۔ اور کسی کو خبر نہ ہو۔ کیونکہ

اِنَّھُمْ اِنْ یَّظْھَرُوْا عَلَیْکُمْ یَرْجُمُوْکُمْ اَوْ یُعِیْدُوْکُمْ فِیْ مِلَّتِھِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝

وہ لوگ اگر خبر پالیں گے تمہاری۔ تو تمہیں ماریں گے۔ یا اُلٹا اپنے دین میں پھیر لیں گے۔ پھر تو تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے۔ کہ استبداد اور ظلم کرنے والوں کی چیرہ دستیاں کتنے زور پر ہوتی ہیں۔ کہ سالوں بعد جب بھی آئے۔ تو وہی خوف مسلّط ہے۔ کہ کہیں پھر مار کر اُلٹا اپنے دین پر نہ لے جاویں۔ اور ہمارا کیا کرایا ضائع نہ کر دیں۔

سبحان اللہ یہ ہے ایمان - اپنے وقت کا پیغمبر نہیں دیکھا لیکن اللہ تعالیٰ
نے اپنے خاص فضل سے رُشد کے سامان پیدا کر دیئے - اور ایمان کی پختگی اس
درجہ پر پہنچ گئی - کہ گھر بار چھوڑ کر ایک کھوہ میں وقت بھی پورا کر لیا لیکن پھر بھی
خوف تو اپنے ایمان ضائع ہونے کا ہے - اس کے بعد پھر ایک سبب اس حال
کے کھولنے کا بیان فرمایا جاتا ہے - جیسے پہلے کَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ کہہ کر
یَتَسَآءَلُوْا فرمایا گیا تھا - یہاں فرمایا جاتا ہے -

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ	اسی طرح خبر ان کی ہم نے کھول دی تاکہ
لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ	لوگ جان لیں - کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ
وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا -	حق (ٹھیک) ہے - اور قیامت میں

کوئی شک نہیں یعنی ضرور آئے گی -

پہلے سبب میں بتلایا گیا تھا - کہ خود اصحابِ کہف کی ذات کو احساس دلانا تھا -
کہ کچھ اُن کے حال میں تبدیلی ہو گئی - اور اس آیت میں ان کے اطلاع کی شہرت اس لئے
کی گئی - کہ ایمان داروں کو جو اس وقت ایک دُنیا توحید قبول کر چکی تھی - اپنے عقیدۂ
اخروی میں محبت ہو جاوے - کہ اللہ تعالےٰ کا فرمودہ حق ہے - اور مرنے کے بعد
ہم اٹھائے جائیں گے - اصل میں عقیدہ آخرت پختہ ہو جاوے - تو پھر کسی عمل میں
سستی نہیں رہتی - اور ہر عمل پوری جان سے عمل میں لایا جاتا ہے - یہ کس وقت
شہرت نام ہوئی - جبکہ

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ	وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جبکہ اس
فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ	زمانہ کے لوگ ان کے معاملہ میں باہم

جھگڑتے تھے (اشرف علی)

قرآنی اسلوب یہ ہے۔ کہ کسی قصہ مثالی کو تمام بیان نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اس حصہ کو بیان میں لیتا ہے۔ جس سے اس کے نتائج رشد حاصل کرنے ہوں۔ اور ساتھ ہی جب کسی واقعہ کی کڑیاں ملاتا ہے۔ تو معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ سلسلۂ کلام کی طرح درمیان میں وقفہ نہیں لیکن امر واقع ایسا نہیں ہوتا۔ سالوں کے وقفے اور عرصے ہوتے ہیں۔

یہاں بھی وہی حال ہے۔ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ کے حصہ کے ساتھ فوری کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ زمانہ گذر گیا۔ اصحابِ کہف زندہ تھے۔ اور پھر اپنے وقت پر تمام ختم ہو گئے۔ لیکن جیسے کہ عام فطرتِ انسانی اچھے لوگوں کے مرنے کے بعد نشانات قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ اسلامی قبریں بھی ایک ایسی فطرتی خواہش ہے لیکن جب کوئی اہم ہستی ہوتی ہے۔ تو اس کے لئے معمولی نشانات پر فطرت قناعت نہیں کرتی۔ اور چاہتی ہے۔ کہ اس ہستی کے برابر نشان بنائے۔

"اصحابِ کہف" عام انسانی ہستیاں نہ تھے۔ بلکہ خواص اور خدائے قدوس کے برگزیدہ ہو چکے تھے۔ اور خاص و عام پر ان کی پاک زندگی اور ان کے بلند مقصد کا پرچار ہو چکا تھا۔ اس لئے اس وقت کی رائے عامہ اور فطرتِ صالحہ ان کے نشان قائم کرنے کا ارادہ کر چکی۔ چنانچہ عام تجویز ان کے نشان پر عمارت قبے بنانے کی ہو گی۔ کسی کو یہ خیال نہ آئے۔ "قبّے" کہاں سے نکالے۔ سمجھانے کے لئے "قبّے" کا لفظ لکھ دیا گیا۔ لیکن قبروں پر عمارت بنانا کیا ہوتا ہے۔ یہ ہی قُبّے۔ اور روضے۔

رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ۔ اُن کا رب اُن کو خوب جانتا ہے (اشرف علی)

یہ ایک ایسا جملہ ہے جس کا تعلق بظاہر سیاقِ قصہ سے نہیں۔ درمیان میں یہ ایک تعلیمی جملہ آگیا ہے۔ کہ وہ نشان کی عمارت بنانا چاہتے تھے لیکن ظاہری نشان پر ان کی حقیقتِ حال کو خیال، نہ کرنا چاہیئے۔ ان کا برزخی حال تو اللہ کو ہی معلوم ہے۔ اور یہ کہ وہ کیسے گزرے۔ اور کہاں فوت ہوئے۔ یہ "بِہِمْ" "ان" کا جواب ہے۔ کہ اصل قصہ کا علم تو اللہ کو ہے۔ یہ اٹکل بنا رہے ہیں۔ کیونکہ صدیاں گذر گئی تھیں۔

قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَّسْجِدًا ○

جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے انہوں نے کہا۔ کہ ہم تو ان کے پاس مسجد بنائیں گے۔ (اشرف علی)

غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِهِمْ سے مراد غلبہ عام مفسرین لیتے ہیں۔ کہ جن کی حکومت تھی۔ وہ رائے عامہ کے ساتھ متفق نہ ہوئے۔ چونکہ حکومت دیسمار ہو چکی تھی انہوں نے صرف نشانات بنانے پسند نہ کئے۔ بلکہ عبادت خانہ بنانا تجویز کیا تھا۔ کیونکہ موحد تھے۔ اور ساتھ ہی اصحابِ کہف کے ساتھ ایک نسبتِ خاصہ بھی مسجد کو تھی۔ اس لئے عام خیال سے ہٹ کر ایک دینی مقدس تجویز کو پیش کر دیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا۔ کہ قبروں پر نشانات جو بنائے جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ایک دینی جماعت کے لئے مسجد کا بنانا اولیٰ ہے۔ تاکہ نشان کے ساتھ عبادت گاہ کا کام بھی دے۔ اور لوگ وہاں عبادت کریں اور اس مقدس مقام کی برکت سے عبادت کے

۱؎ یا یہ کہ اصل قبریں ان کی کہاں ہیں ۱۲

لطف اُٹھائیں۔ اور نسبتِ غاعۂ منتسبین سے فائدہ اُٹھائیں۔

قصہ میں اس حصہ کا ذکر فرمانا پسندیدگی اور اظہار خوشنودی کے لئے کیا گیا۔ ورنہ کیا ضرورت تھی۔ کہ اس کا ذکر کیا جاتا۔ کہ بعض نے صرف عمارت کھڑی کرنی چاہی۔ تو خواص نے مسجد کو تبادلتہً بنانے کی تجویز پیش کردی۔ چنانچہ مسجد بنائی گئی ہوگی۔

اختلافِ تعدد

جب کوئی شہرت ہو جائے۔ تو فطرت انسانی کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ جتنا ہو سکے اصل حقیقت سے واقف ہو۔ اور چونکہ ایک عرصہ سے ایسے واقعات گذرے ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ جیسا کہ یہ خود قصہ اصحابِ کہف ہے۔ تو ان کی تعداد معلوم کرنے پر اختلاف ہونا ضروری تھا۔ کسی نے مشاہدہ عین واقعہ اور حال کا کیا نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ وہ غار میں ایک خوف سے بھاگتے ہوئے اکے دُکے شامل ہوتے گئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ	بعض لوگ تو کہیں گے کہ وہ تین ہیں
كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ	اور چوتھا ان کا کتا۔ اور بعض کہیں گے
سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا	کہ پانچ ہیں، چھٹا اُن کا کتا (اور) یہ لوگ
بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ	بے تحقیق بات کو ہانک دیتے ہیں۔ اور
وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ	کہیں گے سات ہیں۔ آٹھواں اُن کا

کتا ہے۔ یہ ٹکڑا آیتہ انتقال کا ہے۔ اصل قصہ ختم ہونے پر ایک میانی کڑی ہے جسے ایک گونہ تعلق ہے۔ اور ایک گونہ اصل قصہ سے بے تعلق ہے لیکن قصہ

پر تفریع کا کام دیتا ہے۔ جہاں قصہ پیش کر کے اپنی عنایات ازلیہ کا ذکر اپنے خواص بندوں کے لئے ہدایت پیش کرتا۔ وہاں اس تفریع کے بعد نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم کو ان اخلاق فاضلہ کی طرف رہنمائی فرمائی جاتی ہے۔ جو نبوت کی شان بڑھانے کے لئے اور ہدایت اللہ کو انتہا تک پہنچانے کا باعث ہوتے ہیں یعنی اداب رسالت ہر نائب رسالت اور فریضۂ تبلیغ ادا کرنے والے کے لئے ان آداب کاملہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ تاکہ عظمت و شرف ذاتی ان سے پیدا ہو۔ اور عظمت و شرف کی وجہ سے تبلیغ مؤثر اور اخلاق و عادات تاثر سے پُر ہوں۔

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ط

آپ کہہ دیجئے۔ کہ میرا رب اُن کا شمار صحیح صحیح جانتا ہے۔ اُن کو تھوڑے لوگ جانتے ہیں۔

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں۔ میں تھوڑوں میں ہوں۔ یعنی ایسے معاملات میں کبھی بھی کلی رائے اپنی ظاہر نہ فرمائی جاوے۔ بلکہ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ کہہ کر خاموش ہو جائے۔ اور اپنی کسی اٹکل پر اعتماد نہ کیا جاوے۔ ہاں ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاوے بعض لوگ جانتے ہیں یعنی ان کو جتلا دیا گیا ہے۔ مگر وہ بہت تھوڑے ہیں۔ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ کا جذبہ پختہ ہو کر عقیدہ بن جائے۔

ایک مرض

موجودہ وقت اہلِ تصوف کے معتقدین کے اندر یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کہ ہر غیب سے واقفیت اپنے اپنے مرشد کے لئے ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی

۱۶

کا زور لگا دیتے ہیں۔ اور ارادت مند اپنے شیخ کو جب تک جنیدؒ، بایزیدؒ کے ہم مرتبہ نہ بنا لے سانس نہیں لیتا۔ گو عقیدت ایسی باتیں چاہتی ہے لیکن فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ پر توجہ نہیں ڈالتے۔ اور یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ چوٹی کے افراد تو بہت کم دنیا میں ہوتے ہیں۔ جن پر رازہائے سربستہ کھلے ہوتے ہیں لیکن یہاں یہ ہے کہ ہر ادنےٰ واعلیٰ کے لئے غیوب پر واقف ہونا ہی فقر خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ فرمایا جاتا۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى اپنے غیب پر کسی کو واقف نہیں کرتے مگر جس پر رضا ہو۔ تو گویا رسالت میں بھی امتیاز ہے۔ چہ جائیکہ ولایت میں یہ امتیاز نہ ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ مرید اپنے پیر کو مجبور کرتے ہیں۔ کہ کچھ نہ کچھ ایسی باتیں کہے جن کا اُسے علم ہو یا نہ ہو۔ لیکن علم بالغیب ہونے کا اظہار ہو۔

میرے قبلہ مرشد حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکشوفات اور عرفان کو کبھی بھی ایسے طریقہ پر اظہار نہ فرماتے تھے۔ جس پر عوام وخواص کو حیرت ہو۔ اور جس سے آپ کے عرفان وکشف وتصرف کا اظہار ہو۔ بلکہ دنیاداری اور علل واسباب ساز وسامان سے بیان فرماتے۔ تاہم جو حقیقت ہوتی ہے۔ وہ عیاں ہو کر رہتی ہے۔ آج ایک دُنیا اُن کے عرفان وکشف وتصرف پر ایمان رکھتی ہے۔ دھواں خود آگ کا نشان ہوتا ہے۔

دوسری ہدایت

فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً سو آپ اُن کے بارے میں بجز سرسری

۱۷۹

ظَاهِرًا — بحث کے زیادہ نہ کیجئے۔

ہر صوفی کے لئے یہ لازم ہے۔ کسی مسئلہ اور کسی گفتگو میں نہ اُلجھے۔ بلکہ کچھ کہہ کر خاموش ہو جائے لیکن دیکھنا یہ ہے۔ کہ امت کے رہنما اس ہدایت پر کہاں تک عمل پیرا ہیں۔ بلکہ اب تکرار و بحث ایک نیک مشغلہ خیال کیا جاتا ہے۔ اور اس مشغلہ سے تفرقہ کتنا پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہیں سوچتے۔ تفرقہ اور انتشار کو ہوا نہ دینے کے لئے خاموشی بہتر علاج ہے۔ مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ لیکن ہمارے علم دوست حضرات کہتے ہیں۔ کہ یہ خاموشی دینِ حقہ کی خاموشی ہے جسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن افسوس اس کے نتیجہ پر نظر نہیں فرماتے۔

تیسری ہدایت

وَلَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۝ — اب ان کے بارے کسی سے ان لوگوں سے بھی نہ پوچھئے۔

یہ ہدایت کتنی پر وقار ہے۔ جب کوئی پوچھتا ہے۔ تو وہ اپنے علم اور اپنے وقار کو گراتا ہے۔ اس لئے خواہ اپنے اندر کتنی ہی جستجو اور اکی ہو۔ لیکن ان کے بارے عوام سے دریافت کر کے اپنا وقار نہ گرانا چاہیئے۔ تاکہ دلوں پر عظمت کا سکہ بیٹھا رہے۔ خصوصاً ایسی باتوں کا جن کا تعلق شریعتِ حقّہ سے نہیں۔ اور جن کی لاعلمی سے اصل قصہ اور اُس کے نتائج پر فرق نہیں پڑتا۔

چوتھی ہدایت

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ — آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے

فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ کہ میں اس کو کل کروں گا۔ مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی فعلیت اور کارکردگی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع رکھا جائے۔ اور اپنا بھروسہ اپنے سے اٹھا دیا جاوے۔ اور تمام امور کی سرانجامی کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات پر چھوڑ دیا جاوے۔ اور ایک خالص بندۂ حکم بردار کی طرح زندگی بسر کی جائے۔ ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفت داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

؎ کچھ ارادہ ہو نہ میرا گر ارادہ میں کروں

اب آدابِ رسالت کو ترقی پر لیا جا رہا ہے۔ ابتدائے انسان اور ہے۔ اب بلندی پر لیا جا رہا ہے۔ اور اپنے آپ سے نکالا جا رہا ہے پہلے بشریت کے تقاضوں سے بلند کر کے الوہیت کے انوار سے بھرنا ہے۔

پانچویں ہدایت

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کا ذکر کیجئے

پچھلی ہدایت کے ساتھ اس کا بھی تعلق ہے۔ کہ جب کبھی آپ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کہنا بھول جائیں۔ تو یاد آنے پر یہ الفاظ فوراً دوہرا لیا کریں۔ تاکہ جذبۂ اعتماد نہ ٹوٹنے پائے۔

اور یہ بھی ہے۔ کہ جب کبھی "یادِ خدا" پر نسیان آجاوے۔ یعنی ذہن سے "خدائی تصور" نکل جائے۔ تو فوراً پھر اسی تصورِ الٰہی سے ذہن کو بھرپور کر لیا جاوے۔

174

اور ہر کام اور ہر بات اور ہر امر کو کارسازِ حقیقی سے خیال کیا جاوے۔ اور اپنے اعتماد سے فوراً اعتمادِ الٰہی کی طرف رجوع کیا جاوے۔

چھٹی ہدایت

وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّىْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا

اور کہہ دیجئے۔ کہ مجھ کو امید ہے۔ کہ میرا رب مجھ کو (نبوت کی دلیل بننے کے اعتبار سے) اس سے بھی زیادہ نزدیک بات بتلائے (اشرف علی)

(ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ) اور کہہ شتاب یہ کہ ہدایت کرے مجھ کو رب میرا۔ طرف نزدیک زیادہ کے اس سے بھلائی میں۔

قصہ کا جب ایک پہلو ختم ہو گیا۔ اور چھ ہدایات بھی اس کے متعلق دیدی گئیں۔ جو شانِ رسالت کے مطابق تھیں۔ اور آپ سے یہ بھی کہدیا گیا۔ کہ آپ ہر کام کو مشیّتِ ایزدی کے تابع کر دیجئے گا۔ تو ایک ایسی بات جس کی تمنا اور دلی خواہش قصہ کے رشد پر نبوت کو پیدا ہوتی تھی۔ کہ وہ تو جنگل میں سب کچھ لے گئے۔ اور ایک مدت وحدت کی جھولی میں بیٹھے جھولے جھولتے رہے تب جا کر رشد کا پھل پختہ ہوا۔ کاش مجھے بھی کچھ ایسا حصہ ملتا۔ اور اس سے بڑھ کر ملتا۔

سو اس کے لئے خود ذاتِ اقدس نے پاک ذات رسالت کی تمنا اور خواہش کو اپنے الفاظ سے نبی پاکؐ کے زبان پہ لانے کا حکم فرمایا۔ کہ اسے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بڑھ کر صاحب رشد بنا دیں گے۔ اور وہ

راستہ اختیار فرمادیں گے۔ جو قریب تر راہ رشد ہے۔ از روئے تعلق باللہ اور ازراہِ مجاہدہ۔ اسی ماحول میں وہ سب کچھ مہیّا ہوگا۔ جو ایک ویرانے میں جاکر بھوک اور فاقہ کی زندگی بسر کرنے سے ہؤا تھا۔

ایک اور بات

دیکھئے اصحاب کہف نبی نہ تھے لیکن رشد میں کیا کمی تھی۔ بلکہ خود مالک الملک " مِنْ ھٰذَا" کہہ کر اس کی تصدیق فرمارہے ہیں۔ یہ بات اہلِ علم بھول جاتے ہیں۔ کہ نبوت بے شک ایک بہت بلند درجہ ہے لیکن ولایت کے اندر فیوضاتِ ربّانی اور ہدایت الٰہیّہ کی کیا کمی ہوتی ہے۔ سراسر چشمۂ نبوت کی آبیاری ہوتی ہے۔ اور نبوت کا پورا عکس جمالی وجلالی ٹپک رہا ہوتا ہے۔

اس ٹکڑے سے جہاں نبی کریم کی رشد رسالت کو بلند فرمانے کا اعلان ہے۔ وہاں خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک بشارت دلفروز ہے کہ ذاتِ ربی مجھ پہ رشد کے بہت بلند معیار پر دروازے کھولنے والے ہیں۔ تاکہ ہمت بلند ہو اور آنے والی عنایت ربّانیہ کے لئے کامل انتظار ہو۔

قصّہ کی آخری کڑی

وَلَبِثُوْا فِیْ کَہْفِہِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝	وہ لوگ اپنی غار میں تین سو برس تک رہے۔ اور نو برس اوپر اور رہے۔

قصہ کے اندر دو اختلاف بڑے تھے۔ ایک اصحابِ کہف کی تعداد کا۔ دوسرا اُن کے قیامِ کہف کی مدت کا۔ پہلے کی بابت تو کوئی فیصلہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ تمام اختلافات کا ذکر کر دیا گیا۔ کہ تین چوتھا کُتّا۔ پانچ اور چھٹا کُتّا۔ سات اور آٹھواں کُتّا۔ پہلے دو قول یہود و نصاریٰ کے تھے۔ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ط کے اندر اپنے آپ کو شمار فرماتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ سات اور آٹھواں کُتّا ہے۔

ان کے نام روایتاً مختلف ہیں۔ صاحب قادری نے یہ تمام بیان کئے یملیخا۔ مکسلمینا۔ مسلینا۔ مرنوش۔ برنوش۔ شاذنوش۔ چرواہے کا نام مرطوش اور کُتّے کا نام قطمیر۔ جو خود قرآنِ حکیم نے بیان فرمایا۔ عملیات والے ان کے ناموں کی برکت سے کئی فائدے اٹھاتے ہیں۔ مثلاً آگ سے محفوظ رکھنے کے لئے۔ مرگی کے لئے لکھ کر روغن زرد کے ساتھ دھو کر کانوں کے اندر لگانا۔ عقیمہ (بانجھ) کے لئے لکھ کر کمر سے بندھوانا۔ سر درد کے لئے پڑھ کر دم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ بہر صورت پاک اور خدا پرستوں کے ناموں سے ان کے تقدس کی وجہ سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ کوئی شرک نہیں۔ بہت بڑے بڑے علما و فضلا متقدمین ایسے کرتے آئے ہیں۔ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کوئی کم شرف اپنے علم و فضل میں نہیں رکھتے۔ بلکہ سرتاج علما و فضلا ہیں۔ وہ خود اپنی تفسیر میں نقل فرماتے ہیں

دوسرے اختلاف میں مدت کا کُلّی فیصلہ دے دیا گیا۔ تین سو نو سال کی مدت غار میں رہے۔ غار نہیں کہف میں رہے۔ جیسے پنجابی میں چھڑی اور ڈھوہ سے

تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا ذکر مفصلاً کر دیا گیا۔ آخر یہ کیوں کیا گیا۔ لیکن تھوڑی سوچ کے بعد خود کھل جاتا ہے۔ کہ اصحابِ کہف کی تعداد کی کمی بیشی میں قصہ کے نتائج پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اختلاف مدت کے تعین نہ ہونے میں نتائج میں بہت بڑا فرق پڑ جاتا۔

بلکہ قصہ کی جان یہ ہے۔ "مدت دراز" کھوہ کے اندر رہنا اور زندگی کے تمام ساز و سامان سے کٹ کر زندگی بسر کرنا۔ اور کسی غیر خیال آدمی کا چہرہ نہ دیکھنا۔ اور کسی غیر سے بات چیت نہ کرنا۔ اور صرف رضائے الٰہی کے لئے اتنا بڑا طویل مجاہدہ اٹھانا۔ جسے موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اصل روح ہے۔ اس لئے اس مدّت کی پوری تعیین فرما دی گئی۔ اور ایک اٹل فیصلہ ان الفاظ سے دے دیا گیا۔

مُدّت

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝

آپ کہہ دیجئے۔ کہ خدا تعالےٰ اُنکے رہنے کی مدت کو زیادہ جانتا ہے۔ تمام آسمانوں اور زمینوں کا علم غیب اُسی کو ہے۔ وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسے کچھ سُننے والا ہے۔ ان کا خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ اور نہ اللہ تعالےٰ کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہے۔

اس آیتہ شریفہ سے پہلے بیان کی مزید توثیق کرنا مقصود ہے۔ کہ ان کے اختلاف غائبانہ کشف و کہانت سے ہیں۔ اس لئے کلی فیصلہ کا حق تو

اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جس کے لئے زمین و آسمان کے کُلّی غیب کھلے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی دیکھنے والا اور نہ کوئی سننے والا۔ اس پر مزید یہ کہ اس کے حکم کے اندر کوئی شریک بھی نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اس کے فیصلے کو تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ تمام مذاہب کا سرچشمہ وہی ذاتِ اقدس ہے۔ تو پھر تمام اختلاف کو اس کے فیصلہ پر منسوخ کر دیا جاوے۔ اور صرف وہی فیصلہ قائم رکھا جاوے اور اس پر اعتمادِ کُلّی کیا جاوے۔

بظاہر یہ اپنے بیان کی توثیق کرنا ہے لیکن حقیقتاً یہ سالک کے لئے ایک سبق ہے۔ کہ سب سے زیادہ اعلم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور زمین و آسمان کے کلی پوشیدہ اس کے سامنے ہیں۔ ہر جُزو اور کل کو دیکھنے والا۔ حتیٰ کہ ذرۂ ریگ تک اُس سے پوشیدہ نہیں۔ اور ہر آواز کو سننے والا حتیٰ کہ مکھی کی بھنبھناہٹ کو بھی سنتا ہے۔ اور اس کے فیصلہ کے اندر کوئی شریک نہیں یعنی اسے مشیر ل تک کی ضرورت نہیں۔

کہنے کو تو یہ عقیدہ ہر مسلمان اور ہر صاحب مذہب کا ہے لیکن عملاً اگر دیکھا جائے۔ تو بہت کم لوگ اس عقیدہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ورنہ کسی سے کیوں گناہ ہوں۔ اور کوئی کیوں اپنے علم پر بھروسہ کرے۔ اور کیوں اپنی آواز سے ایسی بات نکالے۔ جو آدابِ حق سبحانہ کے برخلاف ہو۔ اور کیوں کسی کو اپنا کارساز خیال کرے۔ اور کیوں اس کے احکام کے برخلاف چلے۔ کیا ہم رات دن اس عقیدۂ پاک کے برخلاف ہر فعل ہر امر کو اور اس جذبۂ مقدس کے برعکس اپنی زندگی کا شعار نہیں بنائے ہوئے؟۔

اسی جذبۂ پاک پر توحید کا مدار ہے۔ جب یہ مکمل ہو جاتا ہے۔ تو ایک بشر بشریت سے نکل کر عبودیت کے درجہ پر آجاتا ہے۔ اور خدائے قدوس کے خواص میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں یہ حکم عام ہے۔ وہاں خواص کے لئے خاص۔ رسالت کی تو یہ جان ہے۔ اور رسالت کی زندگی کا مدار علیہ یہی جذبہ یا عقیدہ ہے۔ اسی وجہ سے اسے کئی بار رسالت کے سامنے دوہرایا جاتا ہے۔ تاکہ رسالت کی نظر کسی وقت بھی اس سے کم درجہ پر نہ گرے۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ بلند سے بلند مقاصد پر نظر رکھے۔ وہ کیا تھے۔ وہی توحید اور اس کے اوصافِ کاملہ جن کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

بعینہٖ یہی اصل ولایت میں ہے۔ جتنی توحید بلند ہوگی۔ اور اس کے اوصاف، اتنا ہی ایمان کامل ہوگا۔ اسی درجہ پر اس کے اثراتِ توحیدی دنیا اور آخرت میں پھلے پھولیں گے لیکن آہ! مسلمان خصوصاً علمی مسلمان علمی اور عقلی توحید میں الجھ گیا۔ اور حقیقتِ حال سے بے خبر ہوتا گیا۔ یاد رکھئے جو ظاہر اَڑ جاتا ہے۔ اس کی آنکھ باطن کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ چاہیئے یہ کہ ظاہر کی عینک سے باطن کو دیکھا جائے اور الفاظ سے معانی اور معانی سے حقائق پر پہنچنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ۔ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ ط

ہدایت یا حکم

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ آپ کے پاس جو آپ کے رب کی

رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ	کتاب وحی کے ذریعہ سے آئی ہے
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ	وہ پڑھ دیا کیجئے۔ اس کی باتوں کو
مُلْتَحَدًا ٥	(اُسکے وعدوں کو) کوئی بدل نہیں سکتا۔

اور آپ خدا کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔

جب "رَبِّیْ اَعْلَمُ" کا جذبہ بلند پیدا ہو چکا۔ تو اب حکم ہوا۔ کہ آپ قرآن حکیم (جو وحی سے کتاب آئی ہے) پڑھ لیا کریں۔ خود پڑھیں اور لوگوں کو بھی سنائیں کیوں؟ اس لئے۔ کہ اس کے حقائق کبھی بھی بدلنے والے نہیں۔ یہ تمام حقائق تبدل و تغیر سے پاک ہیں۔ تو ان حقائق الٰہیہ کے بار بار ذہن میں آنے سے طبیعت نبوت و رسالت میں پختگی آتی جائے گی۔ اور یقین مستحکم درباره رسالت و نبوت ہوتا جائے گا۔ اور ادائیگی تبلیغ میں آسانی ہوتی جائے گی۔ یہ ایک بڑا گر ہے۔ جو انسان خدائے احکم الحاکمین کی عبودیت پر اتر آئے۔ اور وہ چاہے کہ دنیا اسی رنگ میں رنگی جائے تو وہ اپنے افکار بلند کرنے کے بجائے کتابِ الٰہی کو پڑھے۔ خود بخود اس کی تلاوت سے دل کے اندر انوار الٰہیہ چمک اٹھیں گے اور انوار الٰہیہ کی روشنی کی وجہ سے فریضہ تبلیغ کی زمین ہموار ہوتی جائیگی۔ اور دنیا مسخر ہوتی جائے گی۔ اقبال مرحوم نے عبودیت حقہ کا ایک نقشہ پیش کیا۔ اور خوب کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

خاکی و نوری نہاد — بندۂ مولیٰ صفات

ہر دو جہاں سے غنی — اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل — اس کے مقاصد جلیل

اس کی ادا دل فریب　　اس کی نگاہ دل نواز

خود سوچیئے۔ جب عبودیت اس درجہ پر پہنچ جائے۔ تو پھر کسی کی کیا مجال کہ آنکھ اٹھائے۔ اور سر تسلیم خدائے قدوس کے سامنے نہ جھکائے اور اکڑے۔ الا ماشاء اللہ۔ جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہو۔ اور ان کے کانوں اور آنکھوں سے حق سننے اور حق دیکھنے کی قوت ختم کر دی گئی ہو۔

اس پر مزید فرمایا گیا۔ تمام بھروسے انسانی ہستی سے اٹھا لیئے جاویں کیونکہ ایسے آدمی کے لئے جسے ہم اپنا بناتے ہیں۔ اس کے لئے ہم کوئی دوسری جائے پناہ نہیں چھوڑتے۔ تاکہ وہ کسی دوسری طرف دیکھ سکے۔ اور اس کی آنکھ اور دل دو طرفہ ہو کر رہ جائے۔ اور پورے زور سے فرمایا گیا۔ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا۔ اُس کے سوا آپ کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔

میرے دوستو! یہ ہے توحید کہ انسان کے اندرونی جذبات اس درجہ بلند ہو جاویں۔ کہ خود اللہ میاں اس کے اندر آ کر بول اٹھے۔ کہ ہمارے سوا تمہارا کوئی سہارا نہیں۔ گویا خود اس کی اندرونی فطرت آواز دے۔ کہ اس کے سوا اس کا سہارا۔ کوئی مددگار۔ یا ملجا و ماویٰ نہیں۔

آخری ہدایت اور ارشاد

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ

اور روک رکھ جان اپنی کو ساتھ ان لوگوں کے کہ پکارتے ہیں پروردگار اپنے کو صبح اور شام کو (یعنی علی الدوام) چاہتے

وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝

ہیں اس کی رضامندی کو۔ اور نہ پھر جاویں دونوں آنکھیں تیری اُن سے ارادہ کرے تو بناؤ زندگانی دنیا کا۔ اور مت کہا مان اس شخص کا کہ غافل کیا ہم نے دل اس کے کو یاد اپنی سے اور پیروی کی اس نے خواہش اپنی کی۔ اور ہے کام اس کا حد سے نکلا ہُوا۔ (شاہ رفیع الدینؒ)

اس آیت شریف کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھئے۔ اور غور کیجئے۔ کہ جو لوگ صاحب علم صاحب ہوش کہتے ہیں۔ کہ تصوف و فقر کی کوئی گنجائش قرآن اور اسوۂ حسنہ میں دیکھی نہیں جاتی۔

ان کو اس آیت شریفہ کا ایک ایک ٹکڑا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

دیکھئے پہلے قصۂ اصحابِ کہف اس حقیقت کے عیاں کرنے کے لئے کیا کم تھا۔ اور پھر اس پر جو نتائج دکھائے گئے۔ وہ کیا کچھ اس حقیقت کو عیاں کرنے والے کم تھے لیکن اس آیت نے اس حقیقتِ کبریٰ کو بالکل عیاں کر دیا۔ اور فقر و تصوف کے بنیادی اصول کو ایک آیتہ میں پیش کر دیا۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔

آیت کے چار حصے ہیں۔ اور ہر حصہ اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو حصہ اول۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ

رسالت کو کس زور سے مخاطب ہو کر فرمایا جاتا ہے۔ کہ اپنی ذات کو اللہ اللہ کرنے والوں کے ساتھ جکڑ دو۔ خود سوچیئے۔ یہ جکڑنا ایک اولوالعزم نبی اور رسول کا ایک ایسے گروہ سے جو صرف اللہ اللہ صبح و شام یعنی ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ کیوں ہے۔ خود ذاتِ اقدسِ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا جاتا ہے۔ آپ اپنی توجہ کا مرکز اس گروہ کو بنائے رکھیں۔ اور ان پر توجہ قدسیہ ڈالتے رہیں۔ تاکہ یہ اور بلند ہوں (جیسا کہ ہمارے علم دوست حضرات فرماتے ہیں) دوسرا یہ ہے۔ کہ آنجناب اپنی ذات کو اس گروہ اللہ والوں کے ساتھ جوڑ دیں تاکہ اس گروہ پاک کی وابستگی سے رسالت کی وہ پختگی (یعنی یقین و ایمان) میں کمی نہ آنے پائے اور ان نفوسِ پاک کی برکت سے تبلیغ اپنی شانِ بلند کے مطابق مؤثر ہو۔ خود سوچیئے۔ کون سا جوڑ آیۃ کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ دونوں مطلب اکٹھے آیۃ شریفہ پیش کرتی ہے۔ آگ لکڑیوں کو جلاتی ہے۔ اور لکڑیاں ایندھن آگ کو روشن تر اور شعلہ زن بناتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت یہاں ہے۔ مرشد کے توجہاتِ عالیہ سے مریدین کے حلقہ میں جوش پھیلتا ہے۔ اور اور مریدین کے جوشِ محبّت سے شیخ کی محبتِ قدسیہ جوش کھاتی ہے۔ ایک گونہ شیخ کا حقیقی راس المال یہی فقرا اور مریدین ہوتے ہیں جن کے بل بوتے پر تمام کارخانہ ہدایت چلتا ہے۔ اور جس سے ہدایت اپنے ثمرات کاملہ سے پھلتی پھولتی ہے۔ اب خود سوچیئے۔ کہ جن بے کاروں کا گلہ کیا جاتا ہے کہ یہ بیکار بلا مطلب و بلا مقصد اللہ اللہ کرتے ہیں۔ اور دنیاوی کاموں سے الگ ہو کر قوم پر ایک بوجھ ہیں۔ ان کی اہمیت خود سوچیئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک

کتنی ہے۔ اور اللہ کے رسول کے ہاں کتنی وقعت ہے جس کے سوا فریضۂ تبلیغ پورے طور پر روشن نہیں ہو سکتا۔ ورنہ کیوں اس اہمیت سے وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ کے ساتھ ارشاد عالی ہوتا۔

دوسرا جملہ۔ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ کہ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں یعنی رات و دن۔

دنیا دار اور دنیا وی علوم کے ماہر ذکر اللہ کو ایک بیکاری خیال کرتے تو ان کا حق تھا۔ کیونکہ انہیں حق سے واسطہ نہیں۔ بلکہ دنیا سے جو چیز اور جس کام سے دنیا پیدا نہ ہو۔ وہ ان کے نظریہ میں عبث۔ وہ انسانیت اور انسانیت کے مصالح پر توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ ان کے نزدیک انسانی مصالح کی تمام جڑ دنیا ہے۔ اور دنیا کے اسباب سے فائدہ اٹھانا۔ اور جتنے ساز و سامان دنیاوی سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ ان کے نزدیک وہی بلند ترین اخلاق کا مالک ہو اس کے لئے زنا برا نہیں فسق و فجور کے تمام آئین اس کے لئے مباح۔ ہاں وہ راہ ان کے لئے مسدود اور بند ہے جس سے پیسہ نہ کمایا جاوے۔ دنیا کو جہنم میں جھونک دیا جائے لیکن ان کی آن نہ جائے۔ یہ ان کا بلند اخلاق شمار ہوتا ہے۔ اپنے مطلب کے حاصل کرنے کے لئے ہر مکر و فریب کی اجازت۔ ایک وکیل پیشہ کے لئے حد سے بڑھ کر جھوٹوں سے اپنے مقدمہ کی پیروی اور پھر جھوٹ کے بل فتح کرنا ان کا سب سے بڑھ کر فخر اور اخلاق ہے۔ ایک مہربان وکیل صاحب ایک مجلس میں فرمانے لگے۔ کہ جب کسی دن زیادہ پیسے کماتا ہوں۔ تو زیادہ لذت نماز میں آتی ہے۔ نماز کی لذت اور خدائی قرب تو کیا ہوتا ہو گا۔ دنیاوی مستی ضرور ہوتی ہو گی

جس کی وجہ سے ان کی نماز معراج مومنین کا درجہ حاصل کرتی ہوگی۔

لیکن کیا کہا جاوے۔ ان عالمانِ دین کے حق میں جو سراسر اپنی زندگی کو اپنی زندگی بنانے میں مصروف و مشہور ہیں۔ کہ ان کے اندر دنیاوی وسوسوں نے ایسا گھر کیا ہے۔ کہ صریح احکامِ شریعت اور صریح بیان قرآن کے بعد بھی دنیاوی حجاب ان کے دلوں پر برابر لٹک رہا ہے۔ اور اس ٹکڑے اور اس جیسے فقراتِ قرآنی پر توجہ نہیں کرتے کہ ذکر اللہ کی کیا اہمیت ہے۔ اور کس درجہ قربِ الٰہی اس سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس ذکر اللہ کا مقصد بھی مولیٰ کریم نے خود واضح فرمادیا کہ کوئی دنیاوی فائدہ مقصود نہیں۔ بلکہ دینی مصالح سے بھی بلند مقصد۔ خود اس کی ذاتِ اقدس (یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ) ہے۔ لیکن بُرا ہو دنیاوی محبت کا۔ کہ اب دین کو بھی دنیاوی استواری کا نام دے رکھا ہے۔ اور عبادت جیسی پاک پرستش ذات کو دنیاوی فلاح کا حربہ دیا جاتا ہے۔ فَوَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ وَوَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا یَكۡسِبُوۡنَ ۝ سچ فرمایا اس ذاتِ اقدس نے جس کے لئے زمین و آسمان پیدا کئے گئے۔ اَلدُّنۡیَا رَاۡسُ كُلِّ خَطِیۡٓئَةٍ کہ دنیا ہر گناہ کی جڑ ہے۔ اس سے بڑھ کر دنیا کی کیا بُرائی ہے۔ کہ دین الٰہی کو بھی دنیا کے لئے گھڑ دیا۔ اور اس کی پرورش کے لیئے دنیاوی فلاح اور دنیاوی سامان کے دینی فرائض کا رخ پھیر دیا۔ روزہ کیا ہے۔ افرادِ ملت کے بھوک دکھانے کے لئے اس لئے نہیں۔ کہ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ "تاکہ تم متقی بن جاؤ۔" نماز کیا ہے۔ ایک پریڈ ہے۔ اور عسکری تنظیم کا ابتدائی درجہ۔ اللہ اکبر یہ رجحان اگر سوچا جائے تو دین الٰہی کو کہاں لے جا رہا ہے۔ سراسر دنیا کے جہنم میں جھونک

نہیں رہا ہے۔ اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ کہ ہم دین کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اور دین کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ ؎

کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

کہنے والا کوئی نہیں رہا۔ اور پھر کہا جاتا ہے۔ کہ کوئی آئے اور ہمارے سامنے دلائل و براہین کے ساتھ ٹھنڈے دل سے تبادلہ خیالات کرے

خود سوچئے۔ جب طرزِ فکر اس درجہ پر پہنچ جائے۔ تو ان سے کوئی کیا بات کرے۔ جبکہ خود (وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ) کے مطابق ہو چکے ہوں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بیکس دین پر رحم فرمائے۔ تو شاید کوئی صورت کبھی ایسی ہو جائے۔ کہ اصل اصل ہو جائے اور نقل نقل۔

علماء تو گئے تھے لیکن صوفیا کی ہنڈیا میں بھی اب کوئی جوش نہیں جس ہنڈیا کے نیچے سوز و ساز کی آنچ نہ ہو۔ وہ کب بھلا جوش میں آسکتی ہے۔ اور کب اس کے سالن کو کوئی کھا سکتا ہے۔ اور کوئی کھائے بھی تو کچا بدمزہ۔ نہ بو نہ ذائقہ۔ ہاں جس کو فطرتی لگن ہو۔ وہ کسی قدر اس سے پیٹ بھر لے گا لیکن کھانے کے بعد جب کچا ہونے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہو گا۔ تو ہنڈیا والے کو کیا کہے گا۔ لعنت نہ بھیجے گا تو بے چارہ کیا کرے گا۔ وقت بھی گیا۔ محنت بھی گئی۔ اور پھل بھی نہ پایا۔ وہی کچے بیر۔ یا کھٹے انگور۔ پھر وہی بارگاہِ الٰہی میں عرض ہے۔ کہ الٰہ العالمین! تو ہمارے دین پر رحم فرما۔ اور جیسے کُن سے تو نے دنیا کو پیدا کیا۔ اسی طرح ایک دوسرے کُن سے اس دین کو تازہ فرما۔ اور اپنا کوئی ایسا بندہ پیدا فرما۔ جس کے سامنے یہ دنیا مسخر ہو جاوے۔ اور اس کی ایک جھلک سے دین دشمن

۱۸۵

ہو جاوے۔

آیئہ کا تیسرا ارشاد وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (ترجمہ) دنیاوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (اپنے توجہات محبت) ان سے ہٹنے نہ پائیں۔

واصبر کے جملے میں ارشاد ہُوا تھا۔ کہ ان لوگوں کے ساتھ جو اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔ بیٹھا کریں۔ جو صرف رضا الٰہی چاہتے ہیں۔ اس ٹکڑہ میں مزید عنایات فرمائی جا رہی ہیں۔ کہ ایسے نہ ہو۔ کہ دنیاوی زندگانی کی رونق اور خوش حالی کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کی دلی توجہ ان سے اٹھ جائے۔ اور آپ کا مرکزِ عنایت کوئی اور دنیا کا بندہ ہو جاوے اس ٹکڑہ سے وہ تمام خیال باطل ہو جاتے ہیں۔ جو آج دنیا کو برگزیدہ اور ضروری بنانے کے لئے دینی روایات پیش کئے جاتے ہیں اور دنیاوی فلاح اور دنیاوی تموّل کی زندگانی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بنانے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ اللہ اللہ کرنے والے کون تھے، بینوا تھے۔ بے گھر تھے۔ لوگوں کے صدقے سے پیٹ پالتے تھے جنہیں اس وقت کی اصطلاح میں اصحابِ صفہ کہتے ہیں۔ جو سراسر مشتاقِ بارگاہِ ایزدی حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پڑے رہتے تھے۔ اور ان کے سوا کوئی سروکار اُن کو دنیا اور دنیا کے وسائل اور سازوسامان سے نہ تھا۔ اور وہ اسی میں اپنی زندگانیاں ختم کر گئے۔ آج بھی بعض خانقاہوں میں یہ سلسلہ سنت اللہ کے مطابق چلا آتا ہے۔ کہ خانقاہ میں کچھ لوگ ایسے تعلیم دیتے ہیں۔ جو صرف اللہ کی رضا کے لئے شب و روز اس کے ذکر میں رہا کرتے ہیں۔ اور دنیاوی جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔ کیوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی

کاروبار کرنا نہیں جانتے۔ یا وہ مفت خورہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ محبت کی آگ ان کے دلوں کو زندگانی دنیا سے بلند کرکے مولیٰ حقیقی کے دربار کا عاشق بنا دیتی ہے۔ اور وہ ہر آن اس کی تجلیات اور انوار اور رحمت بلا واسطہ کے منتظر رہا کرتے ہیں۔

لیکن ہمارے علم دوست حضرات ان پر برستے برستے تھکتے نہیں۔ اور جو برائی دنیا کی ہے۔ وہ اُن پر دے مارنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے اور

ع وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۔ جو ایمان رکھنے والے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ [illegible]

لیکن اسلام نے عقل و مشاہدہ کو ایک کر کے دونوں تصورات کو یکجا کر دیا ہے۔ اور صحیح صورت یہی فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ کیونکہ عقل اور دنیا پہلے تصور سے چلتی ہے لیکن روح اور مشاہدات دوسری صورت سے تسکین پاتے ہیں۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ کس صورت میں اپنے آپ کو دیکھ کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن روحانی تسکین کے لئے کیونکہ اسے محبوب مطلوب اور معشوق کی صورت کے سوا دیکھا جائے کیونکہ محبت کا جزو ہی ایک ایسا ہے جس سے دل کی دنیا آباد رہ سکتی ہے۔ ورنہ اس کے سوا یہ دل اجڑا ہی نظر آتا ہے بلکہ ایک بے نور [illegible] ہو کر رہ جاتا ہے۔

محبت است کہ کس راحتی [illegible] آرام
وگرنہ نیست کہ ... ہو گی خواہد

(باقی حاشیہ صفحہ ۶۳ پر)

اس آیتہ یا اس جیسے اور آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ کہ خالق الارض والسمٰوٰت ان کے بارے کیا رائے کا اظہار فرما چکے ہیں۔ اور کہاں تک انہیں یہ گروہ محبوب ہے۔ ان کے بارے ایک اور آیتہ ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ترجمہ۔ (صدقات) اصل حق ان فقیروں کا ہے۔ جو مقیّد ہو گئے اللہ کی راہ میں۔ (اور اسی وجہ سے) وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کی (عادۃ) امکان نہیں رکھتے۔ اور ناواقف ان کو دولتمند (تونگر) خیال کرتا ہے۔ ان کے سوال نہ کرنے کے سبب سے (البتہ) تم ان کے (طرز) چہرے سے پہچان سکتے ہو۔ (کہ فقر و فاقہ سے ہر چہرہ پر اثر ضرور آجاتا

(بقیہ حاشیہ صلا۶۱) ۶ ایسی نماز کو سلام یار نہ ہو نماز ہو

۵ صد کتاب و صد ورق در نار کن روئے خود را جانبِ دلدار کن

اور وہ ارشادِ الٰہی اور اسوۂ حسنہ کے مطابق جواب کے بجائے ہمیشہ صبر سے رہے۔ اور عباداتِ الٰہیہ میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو جاتے ہیں۔

لیکن افسوس صوفیت اپنے اعلیٰ مقام سے زمانہ کے ہیر پھیر کیسے گر رہی ہے۔ اور ہمارے متصوفین بجائے خاموشی و صبر اور عبادت کے تو تو اور میں میں پر اتر آئے ہیں اور جواب ترکی بہ ترکی دینا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک یہ سب کچھ عبث ہے۔ بشرطیکہ حقیقتِ تصوف کو اگر بلند دیکھنا مقصود ہو۔ تو اس کے لئے وہی طریقہ احسن اختیار کیا جائے۔ تم جانو۔

ہے) وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو کچھ مال خرچ کرو گے بے شک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے۔ (تھانوی)

دیکھئے کس محبت بھرے انداز میں ان فقرا کی تعریف کی گئی۔ جو اس کی محبت میں بھرے ہوئے پڑے ہیں۔ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اس پر اکتفا نہیں فرماتے ہیں لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ وہ زمین پر چلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بڑھاپے کی وجہ سے نہیں بلکہ محبت و عشق کی وجہ سے پھر اخفائے حال کا کیسا بلند مقام پایا۔ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ۔ جو ان کے حال سے واقف نہیں وہ تو ان کو دولتمند خیال کرتا ہے۔ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا۔ وہ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ لپٹ کر کے۔ یہ خیال نہ کیا جاوے۔ کہ وہ مانگتے تو تھے۔ بلکہ عام سائل چونکہ لپٹ کر مانگنے کے عادی ہوتے ہیں اس لئے لفظ اِلحافًا کا بڑھا دیا گیا۔ ورنہ اصحابِ صفہ کہاں مانگتے تھے۔ خود ہی کسی کو ان کی بھوک کا احساس ہوتا تو کچھ پیش کر دیتا۔ یا رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ ان کی طرف توجہ دلاتے۔ جب فاقے پر فاقے آجاتے۔

پھر اس جملہ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ط کتنے درجہ اس صدقہ کو بلند کرایا۔ جو ان پر کیا گیا۔ ورنہ کس مسلمان کو یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے لیکن اس صدقہ کی حقیقت کے بلند کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا۔ جو مال ان پر خرچ کرو گے اس کے ہم خوب واقف ہوں گے۔ تاکہ لوگ ان پر خرچ کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

غور فرمائیے اس آیتہ نے ایسے فقراء کو جو اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ پر دھرنا مار کر

بیٹھ گئے ہیں۔ کیا درجہ دیا ہے۔ اور اس درجہ میں کوئی دوسری جماعت شامل ہو سکتی ہے؟ جن کے اخراجات اور ضروریات کے لیئے ایسے پاک الفاظ سے مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہو۔ اور ایسے محبت بھرے الفاظ سے ان کی مجبوری فی سبیل اللہ کو ظاہر فرمایا گیا۔ میرے دوستوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "یہ احصار فی سبیل اللہ" وہ نہیں جس کے لیئے ہمارے دوست دعوت دیتے ہیں۔ وہ بھی زبانی عملاً وہی کچھ۔ جو کچھ ہم گناہ گار ہوتے ہیں یعنی ٹس سے مس نہ ہونا۔ اور زبانی للکار پر للکار دینا۔

مولینا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنا تفسیری نوٹ اس ٹکڑہ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا پر دیا۔ جسے ہم احباب کی خدمت میں پیش کر کے التجا کرتے ہیں۔ کہ وہ اس پر غور فرماویں۔ "مرشد تھانویؒ نے فرمایا۔ کہ اغنیاء کی طرف میل و تواضع جس کی بنیاد ان کا غنا ہو آیتہ اس کی مذمت میں ہے۔

یہ آیت آجکل کے بہت مصلحین کے لیئے قابلِ غور ہے۔ آج "ہر اصلاح" پر زور (خواہ وہ عقاید سے متعلق یا اعمال سے) سب سے زیادہ اسی پہلو سے دیا جاتا ہے۔ کہ اس سے مسلمانوں کی مالی و معاشی حیثیت جائے گی۔ یا اس سے مسلمان سیاسی اقتدار حاصل کر لیں گے۔ وقس علیٰ ھٰذا غرض مقصود "یہ اصلاح" کسی نہ کسی پہلو اور اعتبار سے یہی دنیا اور اس کی سربلندیاں رکھی جاتی ہیں۔

تعلیم قرآنی اس ذوق فاسد سے کس درجہ کرتی ہے؟ (پارہ ۱۵ ص ۴۰۷) "زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" کی حقیقی قدر اسلام کی نظر میں دکھانے اور دیکھنے کیلئے ایک اور آیتہ شریفہ سورہ طٰہٰ کے تکملہ کے طور پر آئی ہے اسے ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (اے نبی) آپ ہرگز اپنی آنکھوں کو ان لوگوں کی طرف نہ پھیریں۔ یعنی محبت بھری نگاہ سے نہ دیکھیں جس کو ہم نے آرائش دنیوی کی آرائش دے رکھی ہے۔ اور اسے دولت مند بنایا ہے۔ کیوں لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ۔ تاکہ ہم انہیں اس دنیاوی زندگی کی آرائشوں اور دولتوں میں آزماویں۔

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (یاد رکھیں) کہ پروردگار کا رزق دیا ہُوا بہت اچھا ہے۔ اور دیر تک سلامت رہنے والا ہے۔

جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جو دنیاوی آلائشوں سے پہلے بھی پاک تھے۔ اور جو معصوم تھے انہیں یہ تعلیم دی جاری ہے۔ کہ آپ کی توجہ دنیاوی مال و متاع والے انسانوں کی طرف ہرگز نہ ہو۔ تاکہ آپ کے دل میں دنیاوی زندگی اور رونق کا وسوسہ نہ پڑ جائے۔ تو ایک ہم جیسے دنیا پرستوں کے لئے یہ حکم یہ ارشاد کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اور پھر اگر رکھتا ہے۔ تو ہم کیوں خواہشاتِ نفسی میں پڑ کر آیاتِ محکم کی تاویلات پر اتر پڑتے ہیں۔ "وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى" کہہ کر دنیاوی سامان و آرائش کو کس درجہ پر ٹھکرا دیا گیا۔ اور لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ فرما کر دنیاوی تعیّش کی حقیقت کھول دی ہے۔ کہ یہ تو ایک آزمائش جہنمی بنانے کی ہے۔ پھر اس آزمائش اس توجہ الی الدنیا سے بچنے کے لئے ایک متبادل تجویز فرمائی۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ اپنے متعلقین اور اپنے لوگوں کو نماز کا

وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ حکم دیتے رہیئے اور صبر کیجئے اس پر

یعنی خود بھی پابند رہیئے گا۔

یہ آپ کی توجہ کا مرکز خود نماز کی طرف توجہ فرما یعنی عبادت خدا کی طرف۔
اور یہی ارشاد اپنے متعلقین منتسبین کے لیئے ہوتا رہے۔ تاکہ یہ جذبہ عبادتِ
الٰہیہ مصمم ہو جاوے۔ اور توجہ الیٰ ماسوا ہٹ جائے۔ کیوں لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا۔
ہم آپ سے رزق کموانا نہیں چاہتے۔ یعنی ہم نے آپ کو رزق کمائی کے لیئے انتخاب
نہیں فرمایا۔ بلکہ اور کام کے لیئے جس کے لیئے ارشاد ہو رہا ہے۔ منتخب فرما کر
مبعوث فرمایا گیا۔ کیوں نَحْنُ نَرْزُقُکَ ہم آپ کو رزق دینے والے ہیں۔
یعنی ہم رزق دے رہے ہیں۔

ایسی صورت سے بھی تمہاری کمائی سے کیا فائدہ۔ جب ہم خود رزّاق ساری
کائنات کے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی۔ کہ پرہیزگاری کا انجام ہی بہتر ہے۔

یعنی آپ پرہیزگاری پیدا کریں۔ اور آخرت پر ایمان محکم بنانے کا کام اپنے
ذمہ رکھیں۔ ان آیات کے پچھلی طرف کی آیت ملاحظہ ہو۔ تو اس حقیقت کو آپ
واضح پائیں گے۔ فرماتے ہیں۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآءِ الَّيْلِ

جو کچھ (باتیں) لوگ کہتے ہیں۔ ان پر صبر فرمائیے اور تعریف کے ساتھ تسبیح کیجئے۔ آفتاب نکلنے اور غروب ہونے سے پہلے۔ رات کی گھڑیوں اور دن

فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ کے اول و آخر میں بھی تسبیح و تقدیس
لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ کیا کریں۔ کیوں اس لئے کہ اس پر
آپ خوش ہو جاویں گے۔ یا خوش رہیں گے۔
عبادت جو سب سے زیادہ اثر پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی اندرونی انشراح پیدا کرتی
ہے وہ رضا بالقضا۔ یا رضا بمقدرات ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا و ما فیہا سے
بے نیازی[1] ہو جاتی ہے۔ اور معبود حقیقی سامنے رہ جاتا ہے۔
مقصود بھی ان آیات سے یہ ہی ہے۔ کہ رسالت اس تسبیح و تہلیل کے سوا
اپنا بھروسہ کسی پر نہ رکھے۔ اور اپنے جد و جہد کا نقطہ مرکزیت یہی عبادت الٰہیہ
شب و روز اور ہر گھڑی و ہر آن۔ اور اس کے اندر کامل انہماک ہو۔ تا آنکہ۔
وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا اور انقطاع عن الدنیا کامل ہو جاوے۔
بعض لوگوں کو دھوکا ہو گا۔ کہ آپ تو سارے کام کاج دنیاوی کرتے تھے۔
اور تمام دنیاوی معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ اول تو یہ رسالت کے اتمام
بعد میں یہ بوجھ دنیاوی بھی چھٹا دیا گیا۔ ورنہ ابتداء یہی کچھ رہا۔ کہ توجہ ذات الٰہی
کے سوا کسی طرف بھی نہ دلائی گئی۔ اور بعد میں بھی اصل دین یہی قرار دیا گیا۔ باقی
تمام امورِ زندگی فروعات اور ثانویہ درجہ پر ہے۔ آپ کی تمام زندگی کا مطالعہ
فرمائیے۔ کس درجہ انہماک ہمیشہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبادت الٰہیہ
میں رہا۔ اور ہر آن اور ہر وقت آپ کی زبان پہ تسبیح و تہلیل اور ایسے جملے چلتے
رہے۔ جو عبودیت کے شانِ اقدس کو بڑھانے پر کیسر آتے تھے! اور معبود حقیقی

---

[1] ہر دو جہان سے غنی اس کا دل بے نیاز

۱۸۹

کی جلوہ آرائی کا پتہ دیتے تھے۔ اور اسی پر مدار رسالت کا تھا۔ اور تمام عمارت دین اسی عبادت ذوقیہ پر کھڑی ہوئی۔ یہ مفلسی و ناداری ہی مسلمان ملّت کا سرمایہ تھا۔ اور اسی مفلسی و ناداری نے جلوۂ الٰہیہ کے درخشان نظارے مسلمان کے دلوں پر کھول دیئے۔ اور اسی مفلسی و ناداری کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمان زندگی کا شعار بنانا چاہتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ اے اللہ تو مجھے مسکین زندہ رکھ۔ اور مجھے مسکین مار۔ یعنے مسکینی کی موت دے۔ اور مجھے مساکین کے گروہ میں اٹھائیو۔ سورۃ طور میں فرماتے ہیں۔

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ

اور آپ اپنے رب کی اس تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیئے۔ کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ اور اٹھتے وقت (مجلس سے یا سونے سے) اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیا کیجئے اور رات میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے۔ (مثلاً عشاء) اور ستاروں کے پیچھے بھی۔

ان آیات کے پیش کرنے سے ایک مقصود تو یہ ہے۔ آنکھوں میں رہنے اور آنکھوں کے پھیرنے۔ اور آنکھوں کے لمبا کرنے کی حقیقت اپنی اپنی جگہ واضح ہو جائے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے۔ کہ ہمارے دوستوں کے اس اعتراض کی حقیقت کھل جائے۔ جو ہر صورت میں عبادت کے معانی کو توڑ موڑ کر کے اس کے مفہوم کو ساری زندگی کے امور پر حاوی کرنے میں مصروف رہتے

ہیں۔ اور ساتھ ایک مسکین زندگی اور یادِ الٰہی کی زندگی کو ایک مسلمان زندگی تصور نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نزدیک اصل مسلمان زندگی وہی ہے۔ جو سیاسی زندگی ہیں اقتدار کی زندگی ہو۔ اور دولت وسامان کی زندگی ہو۔ اور یہی اصل منفعت اسلام خیال کرانے میں مصروفیت کی زندگی ہو۔

موجودہ وقت کے مسلمان دینی جماعتوں کا ادب (لٹریچر) پڑھیں اور پوری توجہ سے پڑھیں۔ پھر غور کریں۔ کہ ان تمام تحریر کا محور کیا ہے! اور وہ جماعتیں کیا چاہتی ہیں لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ذوقِ عبادت اور اس تخیلِ ذاتِ الٰہیہ کی یاد کا بھی نشان واضح یا غیر واضح ملتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ان کی طرف بھی توجہ اس سے بڑھ کر کرنی چاہیئے۔ جو مسلمان کی اصل اساس دین ہے۔ اور جس پر اسلام کی تمام عمارتِ شریعت کی بنیاد ہے۔ ورنہ ہم دنیاوی امور کی شرکت ناجائز قرار نہیں دیتے۔ بلکہ عوام کی زندگیوں کو اس سے وابستہ دیکھتے ہیں۔ صرف ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ اصل منصب رسالت کے تابعدار جو رسالت کے فریضۂ تبلیغ کے سند بلند پر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کیا لائحۂ زندگی ہونا چاہیئے۔ انہیں تو نَحْنُ نَرْزُقُكَ ط کے نشہ سے مست ہو کر تمام دنیوی امور سے دست کش ہونا چاہیئے۔ نہ یہ کہ جو اللہ کے بندے اس نشۂ توکّل سے بھرپور ہیں۔ ان کی پھبتیاں اڑا کر عوام وخواص کو ہٹانے پر دین کی مدار خیال کی جائے لیکن وہ نہیں جانتے۔ کہ اُس کا اثر اُلٹا اُن سے بدگمانی کا پیدا ہوتا ہے۔ اور عوام وخواص متنفر ہوتے ہیں۔ اور اللہ کے بندے تو ان کی اس پریشانی اور غوغائی سے ذرا پریشان نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کو دکھ ہوتا ہے کہ عالمِ باعمل کیوں

بے فائدہ وقت ضائع کر کے اصل کام کو کھٹائی میں ڈال رہے ہیں۔

اگلے دن ایک زمیندار آیا۔ اور اس کے برخلاف بعض نے کوشش کی۔ کہ اوس کی نمبرداری کی زمین چھن جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اس پر اُس جاہل نے عُرفی کا ایک شعر برمحل پڑھ دیا۔ ایک تو حیرت ہوئی۔ دوسرے اپنے حال کے مطابق پایا۔ اور خوب کیف آیا ؎

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نکند رزقِ گدا را

پاک لوگوں اور اہلِ توکّل کے رزق کو کون روک سکتا ہے۔ جب وہ خود عنایت کرنے والے ہوتے ہیں۔ جن کے در پر کُتّے کی طرح ہمیشہ پڑے رہنے کو عمر بسر کرنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی اُس ذاتِ اقدس کے در پر ایک انتظار میں بسر کر دیتے ہیں۔ اور حَتّٰی یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ کا عین مصداق ہوتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کی رقابت بھی بے معنے ہے۔ یہ اور۔ اور وہ اور۔ دونوں کے میدانِ جہاد الگ الگ۔ اقبال مرحوم نے خوب فیصلہ دیا ہے ؎

رقابت علم و عرفاں کی غلط فہمی ہے۔ منبر کی
کہ وہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

آیات صبر و استقامت کے ساتھ آیاتِ ذیل بھی ملاحظہ فرمائیے۔ تاکہ مطلب زیادہ روشن ہو جاوے۔

۱۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ

بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝

۲- وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

۳- فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ

۴- وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝

۵- فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝ اس کے بعد فرماتے ہیں اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ - یعنے یہ لوگ تو دنیا کو پسند کرتے ہیں۔ اور آپ آخرت کے حصہ دار ہیں۔ اس لئے آپ ذکر اللہ اور تسبیح و تہلیل میں وقت بسر فرمایا کریں اور دنیاوی جھمیلوں میں نہ پڑا کریں۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ابتدا اور انتہا کا زمانہ بڑا صبر آزما ہے۔ طرح طرح کی باتوں سے آپ کی ذات اقدس کو دُکھ پہنچائے جاتے تھے۔ ایک نبی اولوالعزم رسول کو ایک کاہن۔ ایک ساحر اور ایک مجنون کہنے سے دل کو کتنا دکھ ہوتا ہوگا۔ اور کتنا سینہ تنگ ہوتا ہوگا۔ جبکہ ظاہری عداوت سے بھرپور تکالیف دی جا رہی ہوں۔ اور چ[illegible] گئے یہ چرچے لیکن [illegible] اللہ

رؤف الرحیم کی تلقین کیسی بلند پایہ اخلاق کو لئے ہوئے اور شفقت بھرے الفاظ و عبارات سے تسلی دلا رہی ہے۔ اور ہر موقعہ صبر کی تلقین کے ساتھ رجوع الی اللہ بصورت عبادت و تسبیح و تہلیل و ذکر اللہ ہوتی ہے۔ اور پھر صبر کے پیدا کرنے کے ساتھ انہماک بعبادت کا حکم ہوتا ہے۔ کیونکہ صبر عبادت سجود و رکوع اور تہلیل و تسبیح کے سوا قائم رہنا ناممکن ہے۔ اس کے ہر موقعہ کے ساتھ عبودیت مطلقہ پر اتر آنے کا حکم ہے۔

صوفی کو کسی جھگڑے میں نہ پڑنا چاہیئے

متقدمین صوفیہ بھی اسی پر رہے۔ ہمیشہ آپ کو ہر طرح کی تکلیفیں انبیاء سے بڑھ کر اپنوں سے رہیں۔ اور بے دین و مشرک کے الفاظ استعمال ان کے بارے ہوتے رہے۔ اور وہ بے دھڑک اپنے کام اور اپنی مشغولیت ذکر اللہ میں برابر مصروف رہے۔ اور کسی کو ایک لفظ جواباً کہنا پسند نہ کیا۔ اب بھی صوفیت کے لیئے یہ طریقۂ سلف رحمہم اللہ کا قائم رکھنا چاہیئے۔ تاکہ اس جھگڑے اور جدال میں اپنے اذواق و اشواق سے بے بہرہ نہ ہونا پڑے اور وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ (مجھے چھوڑ دے اور ان کو) یعنی ہم خود نمٹ لیں گے۔

اب آیت کے دوسرے حصہ پر توجہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا	مت کہا مان اس شخص کا۔ کہ غافل کیا ہم نے دل اس کے کو یاد اپنی سے اور پیروی کی اس نے خواہش اپنی کی اور رہے

کام اس کا حد سے نکلا ہوا (شاہ رفیع الدینؒ)

دوسرا ترجمہ: اور اس شخص کا کہا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔ اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس پہ چلتا ہے۔ اور اس کا یہ حال حد سے گذر گیا ہے۔

اس حصہ کے چار حصے ہیں۔ پہلا اطاعت نہ کی جائے۔ دوسرا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ تیسرا وہ اپنی خواہش کا تابعدار ہو گیا۔ اور چوتھا اس کا کام حد سے گذر گیا۔

حقیقتاً چوتھا حصہ دوسرے کا ایک جزو ہی ہے تصوف میں قلب۔ ذکر اور ہوا کو بڑی اہمیت ہے۔ اور اگر غور کیا جاوے تو تصوّف کا مدار ہی ان امور پر ہے۔

قلب۔ یہ صرف اس لوتھڑے کا نام نہیں۔ جو دل کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ قوتِ روحانی ہے جو اس لوتھڑے دل کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی اور جو انسانی ہستی کا ایک چپّو ہے۔ کہ یہ جس طرف پھر جائے اسی طرف زندگی کا موڑ پھر جاتا ہے۔ اگر دل نیکی کی طرف پھر گیا۔ تو انسانی تمام اعمال و افکار نیکی کی طرف پھر جاتے ہیں۔ اور اگر بدی کی طرف رُخ دل کا ہو گیا۔ تو پھر تمام حرکات و سکنات اور خیالات بدی کے بہاؤ میں بہنے شروع ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اس قلب کو بڑی اہمیّت دی ہے۔ نُزِّلَ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ نَذِيْرًا لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ کہ تیرے پر قرآن حکیم اس لیئے اتارا تاکہ تو

ساری دنیا کو ڈرانے والا ہو۔

کہیں "قلب منیب" اور کہیں "قلب سلیم" بنانے پر توجہ دلائی گئی اور قلب سلیم اور قلبِ منیب پر زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا مدار رکھا۔

مہبطِ وحی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تفسیر بایں الفاظ بیان فرمائی۔

اَلَا فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃٌ اِذَا صَلَحَ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔	ہاں جسم میں ایک لوتھڑا گوشت کا ایسے ہے۔کہ اگر وہ اچھا (اصلاح یافتہ) اور درست ہو تو تمام جسم اچھا اور درست ہے۔اور اگر وہ خراب ہو۔تو تمام جسم خراب ہے۔ہاں وہ دل ہے۔

صوفیائے کرام نے اسی وجہ سے اپنے افعال وحرکات وغیرہ امور کی مرکزیت کو قلب قرار دیا۔اور اپنے تمام مشاغل کا اسے مدار علیہ رکھا اور اپنی اصلاح اور اپنی زندگی کی اصلاح کے لئے بفرمودۂ خدا اور بفرمودۂ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسی قلب کی اصلاح پر اپنی توجہات صرف کر دی۔اور اسے زندگی کا تخم تصور کرتے ہوئے اسی کی آبیاری کو اپنی زندگی کا محور خیال کیا۔جہاں دوسری دنیا کے علم نے اپنی زندگیاں بلند کرنے کے لئے اپنے دماغ کو بلند کرنا اور اپنے علم کو بلند کرنا مقصود بالذّات تصور کیا۔اور "مشاہدہ قلبی" پر علمی استدلال کو پست کیا۔حالانکہ مذہب کی بنیاد علم واستدلال پر نہیں۔بلکہ مشاہدات وکیفیّات قلبی پر مدار ہے۔کوئی مذہب بھی علمی استدلال پر اولاً

ہیں آیا۔ بلکہ مشاہدات روحی کے بعد جو علم عطا ہوا۔ اس پر بنیادِ مذہب پیدا ہوئی۔ یہ وہ نکتہ ہے۔ کہ اگر ذہن میں آجاوے تو آسانی سے یہ تمام مسائل علمی دنیا اور روحانی دنیا میں الجھاؤ پیدا کر رہے ہیں۔ خود اُٹھ جائیں۔

لیکن دیکھئے علمی دنیا نے کبھی بھی اس نکتہ اور اس مرکزیت مذہب پر اتنی توجہ نہیں کی۔ بلکہ امورات مابعد المذہب پر توجہ ڈال کر علمی دُنیا کو مسخر کرنے کے لئے زور تمام صرف کر دیا۔ اور دنیائے عالم سے زیادہ فائدہ اٹھانا اپنا مقصدِ حیات خیال کیا۔ بخلاف اہلِ اخلاص اور اہلِ تقویٰ کے۔ کہ وہ دنیا کو مقصدِ زندگی خیال نہیں کرتے۔ اور نہ ہی دنیا سے مایحتاج سے بڑھ کر کچھ اپنا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ دنیا سے بڑھ کر آخرت پر اپنا دھیان رکھتے ہیں۔ اور اس دنیا کو ایک پُل خیال کرتے ہوئے اس پر ڈیرہ ڈالنا نہیں چاہتے۔

زندگی کے دو نظریے

غرض زندگی کے دو نظریے ہیں۔ ایک دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس دنیاوی زندگی کو اچھے بنانے پر آخرت کا مدار خیال کرتے ہیں۔ اور دوسرے آخرت کو مقدم رکھ کر دنیا کو آخرت کے لئے ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں کیونکہ آخرت کی زندگی اصل زندگی۔ اور دنیاوی زندگی ایک وقتی زندگی چند روزہ ہے۔

سرسری نگاہوں سے یہ بات آسان معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس فرق کو تسلیم کرنا۔ اور پھر اس فرق کے مطابق کسی زندگی پر اپنا زور لگانا اور اس کے مطابق

فلاح سے بلند ہونا ایک بنیادی فرق ہے لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اس فرق کو سمجھتے ہوئے "محورِ زندگی" کے تصورات کو الگ الگ کر دیکھیں۔

۶
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ذکر اللہ - جہاں ذکر اللہ کی بہت بڑی اہمیّت اہلِ دل میں ہے۔ وہاں علمائے کرام کی اہمیت دوسرے اذکار اور صوم وصلوٰۃ سے کچھ زیادہ نہیں بلکہ موجودہ وقت کے علمائے کرام تصوف کی دنیا کے ذکر سے بدکتے ہیں۔ اور ذکر اللہ کو عام علمی دنیا کے مطابق ایک بے فائدہ خیال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ صرف ذکر اللہ کیا اور کس کام کا جب اعمال کو درجہ اول نہ دیا جائے۔ بلکہ اب تو اعمال سے بڑھ کر جب تک یہ جذبہ حکومت الٰہیہ کا اندر جوش زن نہ ہو۔ اور اس جذبہ کے تکمیل کرنے کے لئے ایک جنون پیدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک تمام اعمال باقیات الصالحات کی کوئی قیمت اور کوئی وزن نہیں۔ اور صالحین امت کو ایک بیکار امت کے افراد خیال کرنے کو پھیلایا جانا اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں۔ اور پورے دنیا دار علمی کی طرح اللہ اللہ کرنے کو ایک فعل عبث ہی خیال نہیں کرتے۔ بلکہ ملت کے لئے ایک ننگ اور عار خیال کرتے ہیں لیکن جہاں تک قرآن حکیم کو پڑھا جاوے۔ ذکر اللہ کے لئے بہت کچھ آجاتا ہے۔ اور ذکر اللہ کی اہمیّت تمام اعمال صالحہ سے بڑھ کر نظر آتی ہے۔ بلکہ اعمال صالحہ کی جڑ ہے۔

سب سے پہلے اسی آیۃ زیر غور کو دیکھئے کس طرح وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ سے اس کی اہمیّت واضح

کی گئی۔ ایک رسول امت کو ان افراد امت کے پاس بیٹھنے کا ارشاد ہوتا ہے۔

جو اللہ اللہ صبح و شام کرتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرے فقرے آیت کو دیکھئے۔ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔ جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل ہو اس کی اطاعت مت فرمائیے گا۔

ایک طرف اللہ اللہ کرنے والوں کے ساتھ بیٹھنے کا حکم ہوتا ہے اور دوسری طرف جو اس کی یاد سے غافل ہیں۔ ان کی تابعداری کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن ہمارے علم دوست بزرگ اپنی علمیت کی وجہ سے مطمئن اس حکم شریف سے نہیں ہوتے۔ بلکہ تاویلات در تاویلات میں جا کر ذکر کو نماز اور دیگر اعمال صالحہ کی شکل دیتے ہیں اس لئے ہم کچھ آیات پیش کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

(۱) فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا تم حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو جس طرح اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کیا کرتے ہو۔ بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر۔ (تھانومی)

دیکھئے کتنے صریح الفاظ میں حکم ذکر ہے۔ اور کوئی دوسرا اذکار اس کے اندر آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا کی قید تمام دیگر اذکار سے الگ کر کے صرف اللہ کے نام کے بلند ذکر کا تصور پیش کرتی ہے۔

لیکن ملاحظہ ہو حاشیہ۔

"آیت میں جو حکم یاد کا فرمایا۔ اس میں نمازیں بھی داخل ہیں پس یہ ذکر تو واجب

ہے۔ باقی مستحب "۔

اب غور فرمائیے اصل ذکر کو کس طرح ہڑپ کیا گیا۔ اور اس کی اہمیت کو کتنا کم اس حاشیہ کے ذریعہ کر دیا گیا۔

(ب) اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ — وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ — بھی۔ بیٹھے بھی۔ لیٹے بھی۔

دیکھئے وَعَلٰی جُنُوْبِھِمْ کی قید سے نماز ذکر سے نکل گئی۔ اور اصل ذکر جو بیٹھے۔ کھڑے۔ لیٹے ہو سکتا ہے۔ وہی سامنے آگیا۔ یعنے ذکر اللہ۔

(ج) وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ — اپنے رب کا نام لیتا ہے۔ اور نماز فَصَلّٰی (۱۰ سورہ اعلیٰ) — پڑھتا ہے۔

دیکھئے۔ نماز کے ذکر سے دوسرا ذکر الگ ہو گیا۔ اور یہی ذکر اللہ مراد لئے بغیر کوئی دوسرا ذکر اس جگہ نہیں لایا جاسکتا۔

(د) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (سورہ دھر) — اور صبح و شام اپنے پروردگار کا نام لیا کیجئے

اس آیت میں کھلے طور پر اِسْمَ رَبِّکَ فرما کر تمام شکوک مٹا دیئے گئے

(ھ) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (۸ مزمل) — اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو۔ اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو۔

یہاں بھی "اسم ربک" سے اللہ کے ذکر کو ذکر نام سے پڑھنا کہا گیا۔

(و) فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ — وہ ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے

تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ (النور ۳۶) جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ادب کیا جاوے۔ اوران میں اللہ کا نام لیا جاوے۔

مسجدوں میں عبادت خانوں میں ذکر اللہ کرنے کی وجہ سے شرف دلایا گیا۔

(ز) يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا۔ (سورہ حج) خلوت خانوں۔ عبادت خانوں۔ اور مساجد جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔

(ح) تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ط (الرحمٰن ۷۸) بڑا بابرکت نام آپ کے رب کا ہے۔ جو عظمت والا اور احسان والا ہے۔

یہ آیتہ صریح بیان کرتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا نام بڑا بابرکت ہے۔ اب جو علمی دنیا اللہ اللہ کہنے کو بے کار خیال کرتی ہے وہ ان آیات پر دھیان دے۔

ان آیات کے علاوہ بلند آواز۔ اور آہستہ ذکر کرنے پر بہت سی آیات ہیں۔ جو ذکر" کے طریقہ کو بیان کرتی ہیں جنہیں طوالت کے لئے ہم چھوڑتے ہیں۔

ایسی آیات اور موجودہ تحریر کے مطالعہ پر دھیان کرنے سے صاف ذکر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور تصوف کا نقطہ صاف ہو جاتا ہے۔ پھر خود ہی آیات فیصلہ کرتی ہیں۔ کہ ذکر کیا فائدہ دیتا ہے۔

فائدہ ذکر

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ وہ لوگ (منیب) ہیں۔ جو ایمان لائے اور

قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ط اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان (آرام) ہو جاتا ہے۔

ذکر کا فائدہ بھی بیان فرما دیا۔ کہ ذکر اللہ دالوں کو اطمینان اور آرام دیتا ہے۔ اور یہی کچھ ماحصل دین و دنیا کا ہوتا ہے۔ دل مصفّٰے ہو کر مطمئن ہو جاوے اور خواہشات نفسانی کم ہو جاویں۔ اور وساوس دنیاوی اُٹھ جاویں۔ خواہشات روکنے کے لئے ذکر اللہ ایک بہت بڑا علاج ہے۔ جن لوگوں نے اس نسخۂ ذکر کو استعمال کیا۔ ان کے عادات، اخلاق، اطوار غرض جب دل کی دنیا بدل گئی۔ تو باقی افعال و حرکات خود بخود بدل گئے۔ اور نفسِ مطمئنہ حاصل ہو گیا۔

ذکرِ کثیر

اطمینان حاصل کرنے کے لئے "ذکرِ کثیر" بہت زیادہ ذکر کی ضرورت ہے اور جیسے آیاتِ ماقبل سے ثابت ہو چکا ہے۔ کھڑے۔ بیٹھے۔ لیٹے ذکر کرتے رہنے صاحبِ ہوش و عقل کا کام ہے اس لئے رشد حاصل کرنے والوں کے لئے ذکرِ کثیر لازم کر دیا گیا۔ صوفیائے کرام کا قول ہے۔ کہ دل بجز ذکرِ کثیر نمی کشاید (کہ بہت ذکر کے سوا دل نہیں کھلتا) حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں:۔

الف۔ اللہ چنبے دی بوٹی مرشد دل میرے وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیوس ہر رگ ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلن تے آئی ہو

سو جب تک بہت ذکر نہ کیا جاوے۔ ذکر اپنا پھل نہیں لاتا۔
صوفیائے کرام نے دل کی غفلت کا واحد علاج ذکر اللہ تجویز کیا ہے۔
اور علمأ نے افعال حرکات درست اور مناسب کرنے کے لئے
اعمالِ صالحہ پر زور دیا۔ تاکہ اعمالِ صالحہ کے ذریعہ قلب صاف ہو جائے۔
لیکن وہی طریقہ الٰہیہ پہلا ہے۔ نہ کہ دوسرا

ابتدائی ذکر

ابتدائً تو ذکر پہلے زبان سے شروع ہوتا ہے۔ بلکہ بارشاد
کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ہ بلند
آواز سے سالک پڑھنے پر مجبور ہے۔ لیکن بعد میں جب ذکر اپنے ابتدائی
مرحلہ سے نکل جاتا ہے۔ تو پھر اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْیَۃً میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور قیام۔ قعود۔ اور عَلٰی جُنُوْبِھِمْ
پر آجاتا ہے۔ اور ہر سانس کے ساتھ خود بخود چلنا شروع ہو جاتا ہے۔

آخری ذکر

لیکن جب یہ ذکر پختہ ہو جاتا ہے۔ تو پھر ذکر اس درجہ پر آجاتا ہے۔ جس کا
ذکر ہماری آیت زیرِ غور میں ہے یعنی یاد اور صرف یاد۔ جہاں غفلت کا گذر
کبھی بھی نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ یاد صرف یاد نہیں رہتی۔ بلکہ یہ "یاد" آفتاب
آمد دلیلِ آفتاب۔ خود ذکر اپنے تمام اثرات سے جسم و جان میں چمکنے دمکنے

لگتا ہے ۔

بے شک یہ علمی علاج بھی صحیح ہے لیکن طریق کار الگ الگ ہو جانے کی وجہ سے یہاں تک نوبت نہیں پہنچنی چاہیئے ۔ کہ جو علاج صلحائے امت نے تجویز بحکم قرآن کیا ہے ۔ وہ سراسر غلط ہے ۔ اور اللہ اللہ کرنے سے کیا فائدہ ۔

یہ خیال نہ کیا جاوے ۔ کہ جو کچھ سوءظن ظاہر کیا گیا ہے ۔ غلط ہے ۔ بلکہ یہ صورتِ حال مخلصین کے ہر فعل میں موجود ہے ۔ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں ۔ بے شک موجودہ صوفیت بھی کچھ اچھی صورت اپنی پیش نہیں کرتی ۔ لیکن اس کمزوری کی وجہ سے اصل حقائق تصوف پر پھبتیاں اڑانا بھی صاحبِ علم و برکت کے لائق نہیں ۔

میرے قبلہ مرشد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ذکر کی تلقین کے لیئے اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے ؎

تصوّر دل میں رکھے ذاتِ حق کا
ہر وقت و ہر حال و ہمہ جا
زباں خاموش ہو پر دل میں جاری
رہے ہر وقت ذکرِ ذاتِ باری

اس وقت یہ مردِ مجاہد پورا نمونہ رسالت ہو جاتا ہے ۔ اور تخلقوا باخلاق اللہ کی صورت و سیرت کا نقشہ ہو کر امتِ محمدیہ کا رہبر ہو کر امت کو ضلالت اور گمراہی سے بچاتا ہے ۔ اور رشد و ہدایت کا ایک مینارہ

۲۰۳

ہو کر دنیائے عالم کو صراطِ مستقیم کی روشنی دیتا ہے۔ اور اندھی دنیا کی بینائی کا باعث ہوتا ہے۔ اور حَوَالَيْهِ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ط ہر طرف سے اس کی طرف خلقت بکثرت لوٹتی ہے اور آتی جاتی ہے۔

ھوا

ہوا کے معنے خواہش کے ہیں۔ جو ہر بشریت کے اندر سے بے انداز بے شمار پھوٹتی رہتی ہے۔ اور جس کے پھوٹنے سے نفسِ انسانی کو تو بیشک تقویت پہنچتی ہے۔ اور نفسِ انسانی موٹا تازہ ہوتا ہے لیکن نفسِ انسانی کی حقیقی موت کا باعث بھی یہی خواہش ہوتی ہے۔ جب ان کے اندر جوش آجاتا ہے۔ اور ایک خواہش کے پیچھے دوسری خواہش قطار در قطار نکلنی شروع ہو جاتی ہے۔ تو یہ خواہشات دل کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔ اور قلبِ مصفّٰی کا خون چوس کر اس کو بے جان کر دیتی ہے۔ جس سے قلب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور قلب بے کیف ہو کر مر جاتا ہے۔ اور یہ موت حقیقی انسانیت کی موت ہوتی ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ تعالیٰ کو بھول گئے جس کی وجہ سے اپنے نفسوں کی حقیقت کو بھول گئے۔ بھلا جو اپنے آپ کو بھول جائے وہ ایسی خیر (اللہ کی یاد) کیسے پا سکتا ہے۔

اہلِ تصوف کا یہ دوسرا حقیقی اور بنیادی مسئلہ ہے۔ کہ خواہشاتِ

۲۰۴

نفسی کو کلی طور پر رضائے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے روکا جائے۔ تاکہ دل ان خواہشات سے رُک کر صرف ذاتِ حق سبحانہ کی طرف رجوع کرے اور اس کے دیکھنے کی تڑپ پیدا ہو جائے۔

خود سوچئے کہ جب یہ مقولہ مشہور ہے۔ کہ دو دل بودن بجز بے حاصلی نیست۔ دو دل ہونا کچھ پیدا نہیں کرتا۔ لیکن جب خواہشات ان گنت نفس پر آجائیں تو پھر کیسے حق سبحانہ کی طرف وہ متوجہ ہو سکتا ہے۔ عام خیال ہے کہ دنیا نام ہے خواہشات کا۔ اور دنیا ان خواہشات نفسی سے زندہ اور پُر رونق ہے۔ اگر یہ نہ ہوں۔ تو کارخانۂ قدرت بیکار ہو جائے۔

ایک اعتراض کہ تصوّف سے دنیا ویران ہو جائیگی

بعض دنیا کے بندے اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اہل تصوف کے جہاں میں آنے سے تو دنیا ویران ہو جائے گی۔ اور یہ جگ باطل ٹھیرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاک بندے خود فرماتے ہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط

لیکن یہ نہیں سوچتے۔ کہ ساری دنیا کی طبیعت کیسے یہ جذبہ قبول کرتی ہے خالق الارض والسماء نے ہر انسان کی فطرت الگ الگ بنائی۔ اور اس فطرت کے مطابق عالم دنیا میں وہ کام کرتا ہے۔ اور اس فطرت کے مطابق اپنے خیال ڈھالنا اور ان خیال پر چلنا اپنی زندگی خیال کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام انسانی دنیا الگ الگ پیشوں میں تقسیم خود ہو گئی۔

اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت بالغہ اپنی بلند ہے۔ کہ حسب ضرورتِ دنیا تبدل و تغیر خیالات ہوتے ہیں۔ اور حسبِ ضرورت دنیا ان خیالوں میں ڈھل کر مختلف انواع اور مختلف خدمات کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا جاتا ہے! اور وہی اپنے مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ دنیائے عالم میں اپنا حصہ وہ خدمتگذار ہو کر ادا کرتا ہے۔

لیکن جیسے کہا گیا۔ کہ حسب ضرورت فطرتاً اشیا پیدا ہوتے ہیں اور جن اشیا کی ضرورت کم ہے۔ وہ اشیا ہی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کی ضرورت زیادہ ہے زیادہ پیدا کئے جاتے ہیں۔ غلہ کی ضرورت زیادہ ہونے کی وجہ سے انسانی ہستی کو کاشتکاری کی توجہ زیادہ دی گئی۔ بخلاف باغبانی کے۔ اس کی طرف کم رجوع دلایا گیا۔ اور باغبانی کی طرف توجہ نسبتاً کم کی جاتی ہے۔

سورج اور چاند صرف ایک ایک ہے۔ ایک دن کے لئے اور ایک رات کے لئے۔ لیکن ستارے زیادہ بنائے گئے۔ ستاروں سے کچھ اور کام لینا تھا۔ جن کی ضرورت زیادہ تھی۔ لیکن سورج ایک ہی بنایا گیا۔ ورنہ اس کی قدرت تو سینکڑوں سورج بنا سکتی تھی۔ اسی طرح چاند بھی کئی بنائے جا سکتے تھے۔ لیکن ایک پر اکتفا کیا گیا۔ آفتابِ رسالت تو صرف ایک تمام امت کے لئے خاتم الرسل نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منتخب فرمایا گیا۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط لیکن ستارے کئی پیدا کئے گئے۔ اور اولیائے امت ان گنت فرمائے گئے۔ اور فرمائے جائینگے۔

اور پھر ہر ایک کی طبع کو الگ فطرتوں پر ڈھالا گیا۔ گو کام ایک ہے لیکن حسب ضرورت ان کی طبیعتوں کو الگ الگ بنا کر دنیائے عالم کو روشن فرمانے کی تجویز فرمائی گئی۔

لیکن جیسے سارے عالم کو ستارے اور ماہتاب نہیں بنایا گیا۔ ایسے ہی ساری دنیا کو ولی اللہ بنانے کی مشیت نہیں۔ اور کوئی انسان اپنی فطرت کے سوا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ایسے ہی ہر آدمی کی فطرت ولی اللہ بننے اور اللہ اللہ کرنے کی نہیں۔ ورنہ دنیا میں کوئی کافر نہ ہوتا۔ مگر کافر دنیا میں بہت زیادہ اور مسلمان بہت کم ہیں۔

ایسے ہی تصوف کی دعوت پر یہ نہ کہنا چاہیئے۔ کہ یہ دنیا کو بے کار بنا کر دنیا کو ویران کرنا چاہتے ہیں۔ یا یہ خواہشات کو مٹا کر دنیا کو بیکار بنانا چاہتے ہیں۔

بے شک اس دنیا سے چند آدمیوں کو اٹھا کر اور الگ کر کے اُس دُنیا (آخرت) کے لئے مشعلِ راہِ ہدایت بنانے کے لئے خواہشاتِ نفسی کو بند کر کے عام تقاضوں سے الگ کر کے "فطرتِ الٰہیہ" کے عکس حاصل کرنے کے لیئے ضروری ہے۔ اور وہ کوئی بلند ہمت ہوتا ہے جس کی فطرت دنیا دی عالم سے اٹھ کر عالم بالا کی طرف اُٹھے۔ اور کنگرۂ افلاک پر بیٹھ کر تقدیس و تہلیلِ حق سبحانہ کا حق ادا کرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کسی دوسرے کے حصہ میں یہ دولت نہیں۔ بلکہ حسب ضرورت ہر انسانی فطرت کے لیئے ہدایت اور رُشد کی ضرورت ہے۔ اور اسی کے مطابق

وہ دُنیا سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ اور خواہشاتِ نفسی کو روکتے ہیں اور دنیا کے لئے یہ لوگ مبارک ہوتے ہیں اور جیسے سورج کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اور آنکھیں راہ نہیں دیکھ سکتیں۔ ایسے ہی ان پاک ہستیوں کے سوا صراطِ مستقیم کا سامنے آنا محال ہو جاتا ہے۔

زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ ایک جدوجہد دنیاوی ہے اور دوسری روحانی۔ دونوں کی وسعت بے پایاں ہے۔ اور دونوں کے اکٹھے کرنے کا نام اسلام ہے۔ یہی بنیاد ہماری تحریر کی ہے۔

عمر بیربلوی

تمام سلوک کا خلاصہ

ایک کامل سالک کی دعا بارگاہ ربوبیت میں

قبلہ عالم محبوب الٰہی دام ظلہٗ نے اپنے خصوصی اوقات میں بارگاہ الٰہی میں پُر درد دل سے ایک صدا نکالی جو اشعار کی صورت میں زبان مبارک سے نکلی الحمد للہ تمام تصوف کا خلاصہ اور سالک کے تمام انتہائی اور ابتدائی احوال اس دعا میں آ گئے۔ ہر سالک کیلئے عموماً اور برادرانِ سلسلہ کیلئے خصوصاً یہ ضروری ہے کہ غلبۂ حال کی صورت میں انہی الفاظ میں اپنی التجا بارگاہ رب العالمین میں پیش کی جائے انشا اللہ ایک عجیب کیفیت رونما ہو گی۔

دمبدم تیرا تصور ہی رہے اور جستجو — ذکر تیرے سے رہے معمور میری گفتگو

کر محبت ذات اقدس کی مجھے یارب عطا — تاکہ میں سب بھول جاؤں جو کہ ہے تیرے سوا

نیک و بد اغیار کی اُٹھ جائے بھی مجھ سے تمیز — اور تیرے ماسوا ہرگز نہ ہو مجھ کو عزیز

یا الٰہی میں تری حمد و ثنا کرتا رہوں — شکر تیری نعمتوں کا میں ادا کرتا رہوں

آنکھ میری بند ہو اور قلب ہو میرا کھلا — پھر تجلّی طور کی ہر دم رہے اس پر سدا

موت سے پہلے ہی مرنا مجھ کو ہو جائے نصیب — تا فنائے قلب سے لذّت اٹھاؤں ک عجب

خوف تیرے سے ہمیشہ چشم میری تر رہے — جسم پر لرزہ رہے اور دل میں تیرا ڈر رہے

ساتھ ہی دعویٰ محبت کا رہے یا عزّ و ناز — بے نیازی تیری کا کھٹکا رہے اے بے نیاز

مطلع الانوار سینہ میرا ہو جائے تمام — میں مٹوں سارے کا سارا اور مٹ جائے بھی نام

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ یا اَحَدُ کی ہو جھلک تُو فگن — کچھ نہ ہو کھٹکا کہ میرا کوئی ہے فرزند و زن

وصل تیرا ہو میسر بے تکیف بے قیاس — لیک ظاہر میں رہے تیری شریعت کا لباس

سُنّتِ خیر الوریٰ کی بھی ملے مجھ کو لِوا — ہر نفس پر میں کہوں یا مُصطفیٰ یا مجتبیٰ

آنکھ میری دیکھ لے پھر نور اس محبوب کے — اور حجاب اُٹھ جائے سارا اُس رُخِ پُر نور سے

یہ حقیقت دیکھ کر پھر ہو حقیقت کل عیاں — جس کے کہنے سے لرز جائے زبانِ ناتواں

موت گر آ جائے آسانی سے ہو میرا گزر — جیسے کوئی پل سے گزرے یا کہ راہِ بے خطر

ہاں مسلماں ہو کے جاؤں اس جہاں سے اے خدا — بندگانِ خاص میں پھر رکھیو مجھ کو اے شہا

عصمت و عفت مری کی بھی ملے مجھ کو رِدا — کیونکہ یہ بدکار اب تو ہے بہت رُسوا ہُوا

نفسِ امّارہ پہ قابو دے تو اے قادر کریم — تیری رحمت کے سوا چارہ نہیں اب تو رحیم

اک گھڑی یا اس سے کم بھی مجھ کو اپنے پر نہ چھوڑ — یا الٰہی بحرِ عصیاں میں مری کشتی نہ توڑ

ماں سے بڑھ کر تو ہو اور ہو باپ سے بڑھ کر بھی تُو — یار و مونس میرا تو ہو اور سب کچھ تُو ہی تُو

رات دن تیرا تخیّل ہی رہے مجھ کو مدام — اک گھڑی بھی آئے نہ مجھ کو سوا تیرے آرام

تو بھی میرا ہو رہے اور میں بھی تیرا ہو رہوں — تیری وحدت ذات میں ہو محو میں جیوں مروں

تیرے کانوں سے سنوں گر میں سنوں اے کردگار — تیری ہی آنکھوں سے دیکھوں گر میں دیکھوں بار بار

کچھ ارادہ ہو نہ میرا گر ارادہ میں کروں

جو ارادہ تو کرے، وہ پھر ارادہ میں کروں

(گلزارِ عالم پریس لاہور)